عکس
نگار عظیم

مختصر افسانوں کا یہ مختصر سا مجموعہ ایک ایسے تخلیق کار کی شبیہہ دکھاتا ہے جس کا مشاہدہ تیز ہے جس نے زندگی کی دھوپ چھاؤں دیکھی ہے۔ انسانی سیرت کے نہاں خانوں میں جھانکا ہے۔ جس کے تخیل کو تجربات نے تمول بخشا ہے اور جس کا دل دردمندی کے جذبات سے معمور ہے۔ بیشک اُس کی تخلیقی بصیرت کے بال و پر ابھی پوری طرح نہیں کُھلے ہیں۔ اُس نے اپنے وجود کو ایک ادائے سپردگی کے ساتھ ابھی فن کے حوالے نہیں کیا ہے۔

نگار عظیم پچھلے نو دس سال سے کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ سیدھی سادی بیانیہ طرز کی کہانیاں۔ وہ افسانہ کے نئے تجربوں اور اُن کی چمک دمک سے مرعوب اور متاثر نہیں ہیں۔ وہ عام انسانوں کی زندگی، اُن کی واردات اور مسائل سے ایک خاص تعلق رکھتی ہیں اور انہی کو کہانیوں کے تار و پود میں سموتی ہیں۔ انہیں

احساس ہے کہ عورت ہونے کے ناطے وہ دھرتی سے اور اپنے ماحول سے جڑی ہوئی ہیں اور اس پر انہیں ناز ہے اس لئے عام انسانوں کی زندگی کی کڑوی کسیلی سچائیاں اُن کے افسانوں میں بار بار آتی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ مردوں کے وضع کئے ہوئے اس سماج میں عورت کو ہر جگہ استحصال اور ظلم و جبر کے شکنجوں میں جکڑا ہوا دیکھتی ہیں اور اس کے خلاف احتجاج کرنے سے وہ اپنے آپ کو باز نہیں رکھ پاتیں۔ حقیقت پسندی ان کا شعار ہے۔ لیکن حقیقت کے دھندلکوں میں وہ اپنے خوابوں اور اپنے آدرشوں کو کھو نہیں دیتیں۔ وہ زندگی کے تئیں عقلیت پسندانہ رویہ رکھنے کے باوجود کچھ مشرقی قدروں پر ایمان رکھتی ہیں۔ وہ جنسی تجربات کے بیان کو ممنوع نہیں سمجھتیں اس لئے کہ جنسی جبلت اور جنسی واردات فرد کی جذباتی اور ذہنی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن وہ جنس کو ایک صحت مند عقلی نقطۂ نظر سے دیکھتی ہیں۔ آیئے اب اُن کی چند کہانیوں کے حوالے سے بات کریں۔

"مرد" میں زمرد اپنی صنفی انا کی تسکین کے لئے ایک غیور مرد اشرف کو فتح کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے وہ اشرف کو نامرد کہہ کر اپنا آخری حربہ بھی آزماتی ہے لیکن اشرف خود ضبطی کی قوت سے یہ وار بھی سہہ لیتا ہے۔ اس لئے وہ واقعی مرد تھا۔ مصنفہ نے یہ کہہ کر ایک نازک نفسیاتی گرہ کھول دی ہے۔ کہانی کا انجام مرد کے بارے میں اُن کے توانا آدرشی نقطۂ نظر کو واضح کرتا ہے۔

"بدلے کا سہاگ" اور "بابا" جیسی کہانیوں میں نگار عظیم نے ایک دوسری ارفع قدر تیاگ اور ایثار کو پیش کیا ہے۔ باپ کی عظیم قربانی اپنی بیٹی کے لئے، اور ثمینہ جس کی حالت کو دیکھ کر شبیر خاں جیسے بے رحم انسان کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ یہ آدرشی حقیقت نگاری کی روایت پریم چند کے فن کا عطیہ ہے جسے نگار نے سلیقہ سے برتا ہے لیکن پریم چند نے کفن اور پوس کی رات جیسی کہانیوں میں سفاک حقیقت نگاری کا جو انداز برتا ہے وہ 'بھوک'، 'زرد پتے' اور 'بیاہ' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نگار اوسط مسلم معاشرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ 'زرد پتے' میں انہوں

نے نسیم اور شمیم کے کرداروں کے وسیلے سے اس طبقہ کے زوال کی دردناک کہانی سُنائی ہے۔ یہ بڑی جرأت کی بات ہے۔ یہاں اُن کے اندر کا فنکار متوسط طبقہ کی کھوکھلی اخلاقیات سے باغی ہے۔ اس لئے وہ سچائی کو اس کے حقیقی تناظر میں پیش کرنے کی جسارت کرتی ہیں۔

یہی جرأتِ اظہار نگار کی بعض ایسی کہانیوں کا خاصہ ہے جو نفسیاتی ژرف بینی کی آئینہ دار ہیں۔ مثال کے طور پر 'فرق' اور 'عکس' جیسی کہانیاں۔ ایسی ہی بے باک کہانیوں کے لئے انہیں اپنے بعض قدامت پسند قارئین کا معتوب ہونا پڑا۔ نگار نے ان کہانیوں نیں علم النفس کی اس مسلمہ حقیقت کو جتایا ہے کہ کوئی بھی انسانی جذبہ مفرد نہیں ہوتا بلکہ مرکب اور ایک حد تک پُراسرار ہوتا ہے۔ اکثر صاحبِ شعور انسانوں کے لئے بھی یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ اُن کے اندر جو جذبہ انھیں بے چین کئے ہوئے ہے اس کی اصل نوعیت کیا ہے۔ اس کا مقصود کیا ہے؟ یہاں انسانی رشتوں اور جذبوں کے بنے بنائے رواجی اور اخلاقی سانچے کام نہیں دیتے۔ ایک فنکار کا درکِ باطن ہی ان کی حقیقت کا سراغ لگا سکتا ہے۔ اسی لئے مشہور ماہر نفسیات فرائڈ نے اعتراف کیا ہے کہ دوستو وسکی کے ناولوں کے مطالعہ سے اس نے علم النفس سیکھا ہے۔

'فرق' کی واحد متکلم ایک پُرکشش نوجوان کی طرف کھنچتی ہے۔ یہ بنیادی طور پر جنسی کشش ہے لیکن چونکہ وہ شادی شدہ ہے اس لئے وہ اس جذبہ کی اصلیت کو سمجھنے اور ماننے سے منکر رہتی ہے۔ تاہم اس کے اندر ایک کشمکش ضرور ہوتی ہے۔ وہ اس چاہت کو ایک نام بھی دینا چاہتی ہے۔ نتیجتاً آخر میں وہ اس پُرکشش نوجوان کو اپنے کمسن بیٹے کی جوانی قرار دے کر اس جذبے کو ایک تقدس بخشتی ہے۔

اس سے زیادہ پیچیدہ اور خوبصورت کہانی 'عکس' ہے۔ نفسیات کا ایک اصول ہے کہ لڑکی اپنے باپ یا بڑے بھائی کو مردانہ وجاہت کا ماڈل مانتی ہے اور اس آئینہ میں اپنے محبوب کے خط و خال دیکھتی ہے۔ 'عکس' کی ہیروئن بھی اپنے باپ کو اپنا آدرش مانتی ہے لیکن خوابوں کی دنیا پر آدمی کا بس نہیں ہوتا۔ وہاں جب مہربان باپ کا اِمیج محبوب کی شبیہ

میں منقلب ہوتا ہے تو معصوم لڑکی کی وحشت اور حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ وہ ایک روحانی اذیت محسوس کرتی ہے اور نہیں جانتی کہ لاشعوری دنیا کی اپنی سچائیاں ہوتی ہیں۔ فنی تکمیل کے نقطۂ نظر سے یہ نگار کی شاہکار کہانیوں میں سے ایک ہے۔

نگار نے آج کی نئی پیڑھی کی لڑکی کی سرکشی، بے باکی، خود آگہی اور خود اعتمادی کی تصویریں بھی بڑی جرأت سے دکھائی ہیں۔ 'بیاہ' میں وہ بتاتی ہیں کہ سماج کی کون سی قوتیں ان کو طوائف بننے پر مجبور کرتی ہیں۔ لیکن 'ریڈ لائٹ'، اور 'روشنی' میں وہ عورت کو مرد کے جبر و تحکم سے نجات کی نئی راہیں دکھاتی ہیں۔ 'روشنی' کی سینتا کو جب جہیز کے لالچی بر ملتے ہیں تو وہ مایوس ہو جاتی ہے۔ مایوسی کے اندھیروں میں خدمتِ خلق کا جذبہ روشنی کی ایک کرن کی طرح نمودار ہوتا ہے اور اُسے بڑی تسکین دیتا ہے۔

الغرض ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں نگار نے معاشرہ اور انسانی رشتوں کے حوالے سے بڑی بڑی باتیں کہی ہیں۔ اس مجموعہ میں کچھ ایسی کہانیاں بھی ہیں جہاں محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کی ٹکنیک پر ان کی گرفت کمزور ہے لیکن ان کی اچھی کہانیوں میں تاثر کی شدت نشتر کی کیفیت رکھتی ہے۔ امید ہے کہ ان کا یہ تخلیقی سفر جاری رہے گا اور اہلِ نظر ان کی کاوشوں کی داد دیں گے۔

قمر رئیس

فروری ۱۹۹۰ء

نگار عظیم کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے فکر و فن کو موضوعات، کرداروں اور کہانی کی فضا کو فن کاری اور پُرکاری سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس کے افسانوں میں سانس لیتی ہوئی زندگی تصنع کی تمام تر آلائشوں سے پاک صاف ہے۔ یہ عام آدمیوں کی زندگی جیسی ہے۔ رشتے ناطے، آپ کی میری دنیا جیسے، کردار نہ اول تا آخر فرشتہ۔ نہ شیطان۔ خوشیاں چھوٹی بڑی۔ بہتر زندگی کا حوصلہ پیدا کرنے والی، محرومیاں الجھنوں میں مبتلا رکھنے والی، جذباتی، ذہنی وابستگیاں اپنی حدود کی پابند: بشری، حد تو یہ ہے کہ اس کے بعض کرداروں کے یہاں پایا جانے والا فرار بھی فطری ہے کہ بہ ظاہر فرار ہے واقعتاً یہ گریز ہے اور بہتری کے لئے ہے۔

نگار نے ایک سچے فنکار کی طرح مثالیت پسندی کو اپنا شعار نہیں بنایا۔ اس نے علامت، استعارے اور قلازمات کی چمک دمک سے اپنی آنکھیں خیرہ نہیں کیں کہ زندگی اس کے نزدیک فنکاری نہیں۔ اس کا انداز اسلوب سادہ، صاف، شفاف اور موثر ہے۔ یہ یقیناً کسی بے ہنری کا مظہر نہیں کہ یہ ہنر بڑی مشکل سے آتا ہے۔

نگار نے آس پاس کی زندگی کو جیسا دیکھا اور پایا بعین ویسا ہی اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ اس کی کہانیوں میں مرکزی حیثیت اور اہمیت عورت کو حاصل ہے وہی ہماری سماجی زندگی کا مرکز و محور ہے۔ رشتے ناطوں کے تعلق سے کہیں زیادہ صاف ذہن (وہ کہیں بھی تلذذ یا جنس کی پوٹ نہیں ہے) کہیں مجبور محض۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیوں میں ایک زیریں لہر تاسف کی ہے، جو وہ قدروں کے مٹنے، مسخ ہونے اور بگڑنے پر محسوس کرتی ہے؛ ایک زیریں لہر کسک کی بھی ہے، جو امید و اعتبار کے کانٹے ہرے رکھتی ہے، جو اُسے زندگی کی اعلیٰ قدروں اور انسان کے اعلیٰ اوصاف سے مایوس نہیں ہونے دیتی۔ ان سادہ سچی اور موثر کہانیوں سے آپ یقیناً اپنے دل کی دھڑکنوں کو ہم آہنگ پائیں گے۔

نگار عظیم نے اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا عکس سے کی ہے، اگلے پڑاؤ میں تخلیقیت کے بہتر نقوش کی توقع یقیناً بے جا نہ ہوگی۔

راج نرائن راز
۴/۲/۹۰

محترمہ نگار عظیم کے یہ افسانے اردو کی افسانوی دنیا میں ایک بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سے بیشتر افسانے "آجکل" نیز دوسرے موقر رسالوں میں پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں ان افسانوں کے مطالعے سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات پر نگار کی بہت گہری نظر ہے ایک لحاظ سے ان افسانوں کو عصری آگہی کا آئینہ بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس انتخاب میں شامل ہر افسانہ کسی نہ کسی واقعہ یا مخصوص حالات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ جو قاری پر تاثر کا ایک گہرا نقش قائم کر جاتا ہے۔ ان افسانوں کے عنوان، ان کی تھیم، سیدھے سادے مگر معنی خیز مکالمے اور نشتر کی طرح چبھتا ہوا ان کا اختتامیہ ایک لمحے کے لئے قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے یہی افسانے کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔

نگار ایک دہائی سے زیادہ عرصے سے افسانے لکھ رہی ہیں اور یہ بڑی بات ہے کہ انھوں نے اتنے تھوڑے سے ہی عرصے میں اردو کے ادبی حلقوں میں اپنا ایک منفرد مقام بنا لیا ہے۔ ان کے متعدد افسانے ملک کے تمام اہم رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور ریڈیو نیز ٹیلی ویژن پر بھی پڑھے جا چکے ہیں۔ نگار کے احباب کی کافی دنوں سے خواہش تھی کہ ان کے افسانوں کو اب یک جائی شکل میں آجانا چاہیے۔ تاکہ ایک طرف تو انھیں ایک دستاویزی حیثیت حاصل ہو سکے اور دوسری طرف نگار کی افسانہ نویسی کا تنقیدی جائزہ لینے والوں کا کام بھی آسان ہو جائے۔ اگرچہ یہ کام کافی پہلے ہو جانا چاہیے تھا مگر شاید ان کی عدیم الفرصتی آڑے آتی رہی۔ اب جبکہ انھوں نے احباب کے اصرار پر اپنے کچھ افسانوں کو یک جائی شکل میں سامنے لانے کا فیصلہ کر لیا ہے، امید کی جاتی ہے ادب نواز حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

ڈاکٹر مسعود ہاشمی

کچھ اپنی بات

میں اپنے زمانہ کے مروضی تنقید نگار علامہ سحر عشق آبادی جیسے استادوں کے استاد سجبان الہند حضرت مولانا ثروت حسین ثروت میرٹھی کا ایک ہلکا سا عکس ہوں۔

علامہ سحر عشق آبادی کا ذکر میں نے اس لئے کیا کیونکہ میرا پیدائشی نام "ملکہ مہر نگار" انھیں کی تجویز سے رکھا گیا۔

ادبی مطالعہ کا ذوق مجھے ورثہ میں ملا۔ درمیانی طبقہ کی روایتی جدوجہد اور پردے کی پابندیوں کے ساتھ باپ اور ماں کی شفقت کے زیر اثر ڈرائنگ میں ایم اے کیا، انھیں احساسات اور حالات نے جو جلا بخشی اس نے تصویر کشی کے ساتھ ساتھ افسانہ نویسی کو بھی جنم دیا۔

لکھتی تو بہت پہلے سے رہی ہوں لیکن ۱۹۷۴ء سے باقاعدہ شائع ہو رہی ہوں۔ ابھی یہ سفر شروع ہی ہوا تھا کہ ۱۹۷۶ء میں شادی ہو گئی اور یوں ایک آرٹسٹ اور روشن ضمیر شوہر و ہمسفر نے اس کو بڑھاوا دیا۔ میرے افسانے انسانی زندگی کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ جن میں انسانی اور جذباتی رشتوں کی اہمیت رہی ہے۔ میں ارد گرد ہونے والے واقعات و حادثات سے متاثر ہو کر بول چال کی سیدھی سادی زبان میں انسانی زندگی کے مسئلوں کو پیش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ بقول تجھے میں علامتی افسانے نہیں لکھ پائی۔ میری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ میری تخلیق سے عوام کا رشتہ برقرار رہے اور وہ صرف پیچیدہ ذہنوں کی خوراک نہ بنے۔ اس بات میں شاید آپ کو ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بنیادی بحث کا کچھ عنصر ملے۔ مگر اس کو آپ ہی طے کریں گے کہ عوامی زندگی سے میرے افسانوں کو کتنی قربت ہے۔ شاید اس لئے کہ میں ایک عورت بھی ہوں، جو زمین سے جڑی ہوئی ہے اور مکالماتِ فلاطون نہیں لکھتی۔

یہ میرے افسانے جو میرے بچوں کی طرح آہستہ آہستہ تخلیق ہوئے ہیں اور جن کی تخلیق میں میں نے ایک ایسا کرب محسوس کیا ہے جو میٹھا بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔ کیونکہ کئی بار تو میں نے تحریری ادبی گالیاں وصول کی ہیں۔

میری نظر میں اگر تخلیق کار سماج کے بھیانک چہرے سے اپنی نظریں چراتا ہے تو وہ سماج کا سب سے خطرناک مجرم ہے اور ناقابل معافی ہے۔ شاید یہی وجہ رہی ہو کہ منٹو کے فن اور بے باکی سے متاثر ہو کر میں جامعہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے کام میں مصروف ہوں۔

میرے افسانے مختلف ادوار میں ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے اور اپنے دور کی رونمائی کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر ریڈیو اور ٹی وی پر بھی پیش ہو چکے ہیں۔ کچھ افسانے ہندی اور پنجابی میں ترجمہ بھی ہوئے ہیں۔

فی الحال دہلی ایڈمنسٹریشن کے ایک اسکول میں ڈرائنگ ٹیچر کا کام انجام دے رہی ہوں۔ اور ساتھ ہی ساتھ شوہر اور چار بیٹوں کو پالنے میں مصروف ہوں۔

لوگوں کے مسلسل اصرار پر اپنی تمام مصروفیات کے باوجود یہ انتخاب حاضر خدمت ہے۔ پسند ناپسند آپ کی ـــــــــ

میں اپنے شوہر اپنے بچوں کی بہت ممنون ہوں جو کبھی میرے کام میں حائل نہیں ہوئے اور ہمیشہ میری ہمت افزائی کی۔

میں اپنے کرم فرما جناب راج نرائن رازؔ صاحب کی بہت ممنون ہوں جنھوں نے ہمیشہ مجھے اچھے مشوروں سے نوازا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ میں اپنے ساتھی مر نزد دوست ڈاکٹر جلال انجم اور محترم ایس۔ پی تلوار (جرنلسٹ) کی بھی ممنون ہوں جن کی کوشش سے یہ انتخاب منظر عام پر آسکا۔

میں محترم ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کی انتہائی ممنون اور شکر گزار ہوں جنہوں نے نہایت مصروفیت کے باوجود اس ناچیز کے مجموعہ کو نہ صرف پیش گفتاری کا موقع دیا بلکہ اپنے فن اور صلاحیت کی دوربین سے ان افسانوں کے بال و پر کو پرکھا۔

میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر حنیف کیفی، پروفیسر عنوان چشتی کی بھی ممنون ہوں جن سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔

نگار عظیم

عکس

افسانے

نگار عظیم

۵۸/C/۳۲۷ بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ اوکھلا۔ نئی دہلی ۲۵

TITLE : AKS

SUBJECT : SHORT STORIES (URDU)

WRITER : NIGAR AZIM ©

H-3 BATLA HOUSE

JAMIA NAGAR

OKHLA, NEW DELHI-25

PUBLISHED : FEB 1990

PRICE : Rs 25=00

کتاب نام : عکس

موضوع : افسانوی مجموعہ

مُصنفہ : نگار عظیم ©

پتہ : C ۵۰۱/۳۳۷ H-3 بٹلہ ہاؤس

جامعہ نگر۔ اوکھلا۔ نئی دہلی ۲۵

سنہ اشاعت : فروری سنہ ۱۹۹۰ء

قیمت : پچیس روپے

کتابت : محمد یامین پھلاودہ۔ میرٹھ

ترتیب : ڈاکٹر جلال انجم

سرورق :

تصاویر :

اہتمام : عظیم صدیقی

ناشر : نگار عظیم

PRINTED BY — SAEED AHMED SIDDIQUI
SOLAR PRINTER
B-64, SECTOR X NOIDA 201301

تقسیم کار : مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ اوکھلا نئی دہلی ۲۵
انجمن ترقی اردو ہند۔ اردو گھر۔ راؤز ایونیو۔ نئی دہلی ۲
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ گلی عزیزالدین وکیل۔ کوچہ پنڈت، دہلی
سادھنا پرکاشن، گل مہر پارک۔ نئی دہلی
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

یہ کتاب اردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی

امّی

اور

والدِ محترم

ثروتؔ میرٹھی (مرحوم)

کے نام

جن کا میں ہلکا سا عکس ہوں

ترتیب

مرد

یہ بات کسی معمولی آدمی کی نہیں، بلکہ شہر کی نامور ہستی فراست علی خاں کے تیسرے بیٹے اشرف علی خاں کی تھی۔ وہ گھر میں سب سے مختلف تھے، ان کی تمام عادتیں بھی مختلف تھیں۔ کھانے اور پہننے کا ڈھنگ بھی مختلف۔ تین برس لندن رہ آئے — لیکن وہی جوں کے توں — ذرا نہ بدلے۔ یوں انھیں روپیہ پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ خاندانی جائیداد اتنی تھی کہ کئی پشتیں کئی درجن بچوں، ماماؤں اور خانساموں کے ساتھ پل سکتی تھیں۔ اور پھر وہ تو ابھی کنوارے تھے اور دو بھائیوں سے چھوٹے تھے۔

ان کے بڑے بھائی ندرت علی خاں نے درجنوں عشق لڑائے تھے اور پھر انھیں میں سے کسی ایک سے شادی کرلی تھی۔ اب دو بچوں کے باپ بن گئے تھے گو ان کی پرانی عادتیں ابھی تک نہ بدلی تھیں۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے والی بات ان پر صادق تھی۔

دوسرے بھائی اختر علی خاں بھی کچھ کم نہ تھے۔ ہاں ان میں یہ بات مختلف تھی کہ وہ ہمیشہ کے لئے کسی بھی لڑکی کی زنجیر اپنے گلے میں باندھنے کو تیار نہ تھے۔ ویسے انھیں لڑکیاں بہت پسند تھیں۔ سب سے زیادہ جمگھٹا انھیں کے پاس رہتا تھا۔ آدھے پورے نہ جانے کتنے بچے ان کے ادھر ادھر پیدا ہوچکے تھے۔ لیکن وہ باپ کسی کے بھی نہیں کہلائے۔

اشرف علی خاں فراست علی خاں کے تیسرے اور سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ پڑھنے لکھنے کے بے پناہ شوقین تھے۔ بڑے دونوں بھائی تو بڑی لے دے کے بعد صرف بی اے اور بی کام ہی کر سکے تھے۔ لیکن اشرف علی نے نفسیات میں ایم اے کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کرلی تھی اور یونیورسٹی میں لیکچرار ہوگئے تھے۔ ان کی خاندانی جائیداد کے آگے ان کی نوکری کی آمدنی بہت معمولی سی تھی۔ لیکن وہ خود بہت سلجھے ہوئے انسان تھے اور اپنے پیشے سے مطمئن تھے۔

جوانی کے ان کے بھی کچھ تقاضے تھے۔ لیکن اس معاملہ میں بھی ان کے کچھ اصول تھے اور ان اصولوں کی حد کو انھوں نے کبھی نہیں پھلانگا۔ اسی وجہ سے انھیں آج یہ دن دیکھنا پڑا۔ یہ بات اس وقت شروع ہوئی تھی جب بڑے بھائی ندرت کی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ کوئی بچہ نہیں تھے ان کے ایم اے کا فائنل ایئر تھا۔ بھائی کی شادی کی پہلی رات تھی کہ پرانی خیرون بوا کی لڑکی زمرد کسی کام سے ان کے کمرے میں آئی تھی اور بڑی چہک کر بولی تھی "ارے چھوٹے صاحب آپ یہاں؟ وہاں دیکھو کیا کیا ہورہا ہے" ——— "کیا ہو رہا ہے؟" انھوں نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔ "ارے بڑے مزے آرہے ہیں۔" "دلہن کے ہاتھ پر رکھ کر دولہا کو کیسی کھیر چٹائی جارہی ہے اور دولہا دیکھنا سارے بدلے گن گن کر رات کو نکالے گا۔ ابھی تو سہاگ رات ہوگی نا؟"

زمرد ان کے سامنے بچی سی پلی تھی۔ انھیں کے سامنے اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ اس کے تیکھے انداز انھیں نظر آنے لگے تھے۔ اس کی ضرورت سے زیادہ مہربانیاں اس بات کی دلیل تھیں کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ خود ان کے کاموں میں اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپیاں ان سے چھپی نہ تھیں۔ وہ خود بھی اس کے کاموں کو سراہتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز

نہ تھا۔اس کی اس بے باکی سے وہ پاش پاش ہو گئے۔ غصہ کی ایک لہر ان کے وجود کو دہکا گئی۔

زمرد ـــــ یوں بے لگام کیا کیا بکتی رہتی ہو؟ تمھیں شرم نہیں آتی ـــــ

ـــــ وہ رو دہانسی ہو کر کمرے سے نکل گئی۔ کافی دنوں تک وہ ان کے سامنے نہیں آئی ان سے بات بھی نہیں کی تھی۔ ان کا کوئی کام بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن اس طرح کب تک چلتا۔ بڑی بیگم صاحبہ اور ماں کوئی نہ کوئی کام چھوٹے صاحب کا بتادیتیں تو اسے کرنا ہی پڑتا۔ اگر کبھی اشرف علی خاں کا سامنا پڑ جاتا تو وہ کچھ جھجکتی ضرور تھی ـــــ رفتہ رفتہ حالات پھر معمول پر آگئے۔

اشرف علی کو اب وہ پہلے کی طرح اوچھی اور شریر نظر نہیں آتی تھی بلکہ انھیں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ سنجیدہ سمجھدار اور باوقار ہوتی جارہی ہے۔

ایسی بات نہیں کہ وہ انھیں اچھی نہ لگتی ہو، وہ بے انتہا خوبصورت اور سلیقہ شعار تھی اس بات کا گمان انھیں بھی تھا وہ کسی ماماں یا نوکر یا چھوٹے خاندان کی لڑکی نظر نہیں آتی تھی، ذرا اچھا اوڑھ پہن کر تو اس کے حسن کی نفاست اور بھی نکھر آتی تھی۔ کبھی عید بقرعید کو یا شادی بیاہ میں جب بڑی بیگم صاحبہ اس کے من پسند کپڑے بنواتیں تو وہ کس قدر خوبصورت لگتی تھی۔

گھر میں ماماؤں ان کے بیٹے بیٹیوں اور ان کے بچوں کے کئی خاندان پلتے چلے آرہے تھے۔ زمرد ان سب میں منفرد تھی۔ اس کا نام بھی بڑی بیگم نے رکھا تھا۔ اشرف علی خاں کو اس بات سے سروکار نہیں تھا کہ دونوں بڑے بھائی کس روش پر چلتے رہے ہیں اور کیا کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ خود اس راہ پر چلنے والے نہ تھے اور انھیں اس کا اختیار تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا۔ کہ وہ کوئی مولوی تھے یا دوسری دنیا کی چیز تھے یا انھیں عورت ذات سے نفرت تھی۔ ان کے اندر بھی ایک دل دھڑکتا تھا، چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش تھی۔ کالج کے زمانہ میں کیسی کیسی خوبصورت اور رنگ برنگی تتلیاں ان پر منڈلایا کرتی تھیں۔ کس قدر رنگین ہوتے تھے وہ دن۔ اور جن تین برسوں میں وہ لندن رہ کر آئے تھے تو وہاں کے رنگین قصے وہ کس

قدر مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ اپنے اصول کے پابند تھے۔ ان کے ذہن میں زمرد کو چاہے جانے کا یہ نظریہ ہرگز ہرگز نہ تھا۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے انھیں محسوس ہوتا گیا کہ زمرد کے اندر ایک خاموش جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ ایک خاص جدوجہد۔ اور اس خاموش جنگ کا کوئی تیر جب کارگر نہ ہوا تو اس نے زبان اختیار کرلی۔

اور ایک دن اس نے اشرف علی خاں سے پوچھ ہی لیا۔" کیا میں اتنی ہی بری ہوں جتنی کہ آپ سمجھتے ہیں ؟ میں نے خود کو صرف آپ کے لیے بچا کر رکھا ہے۔ ورنہ تو ــــــ ورنہ تو ندرت بھائی ــــــ" آگے اس کو کہنے کو اب بچا ہی کیا تھا۔" نہیں ایسی بات نہیں تم بہت اچھی لڑکی ہو زمرد ــ مجھے تم پسند ہو" "تم سارے گھر کو پسند ہو" ــــ "تم سارے گھر کی عزت ہو" ــــ تمہاری شادی ہم بہت اچھی جگہ کریں گے۔ ذرا سمجھداری سے کام لو۔ جیسا تم میرے لیے سوچ رہی ہو میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میں وہ نہیں ۔۔۔۔۔۔"

سوچ لیجیے ایسا کہنے سے آپ کی نوابی شان میں کچھ فرق تو نہیں آجائے گا ؟"

نہیں ہرگز نہیں ۔"

چار برس اسی کشمکش میں گذر گئے لیکن زمرد اشرف علی کو پگھلا نہ سکی اور نہ خود کو پتھر بنا سکی۔

زمرد کی شادی کا صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا، اشرف علی خاں اپنے کمرے میں کسی کتاب کا مطالعہ کرتے کرتے سو گئے تھے کہ انھیں کسی کی گرم گرم سانسوں کا احساس ہوا۔

یہ زمرد تھی۔

زمرد تم یہاں ؟ اس وقت ؟" ہلدی ابٹن اور زعفران کی ملی جلی خوشبو ان کے نتھنوں میں گھسی جارہی تھی اور وہ نظریں نیچی کیے ہوئے ان کے سامنے کھڑی تھی۔

" زمرد" ــــــ وہ مجسم سوالی تھے ۔۔۔۔۔"

جی ــ جی وہ ــــــ میں نے نادانی میں آپ کو حاصل کرنے کی قسم کھائی تھی اب جب کہ میں جارہی ہوں تو کیا میری قسم ۔۔۔۔۔"

زمرد ــــــ کمرے کے در و دیوار جیسے لرز گئے ہوں ــ تم ہوش میں تو ہو ــ تم

فوراً یہاں سے چلی جاؤ ــــــ ورنہ ــــ ــــ ورنہ تم بدنام ہو جاؤ گی، کل تمہاری شادی ہے" وہ بڑی مشکل سے جملہ پورا کر سکے ان کی آنکھیں آگ اگل رہی تھیں۔

"بدنام تو آپ ہو جائیں گے چھوٹے صاحب کیونکہ ــــــ کیونکہ میں کہہ دوں گی کہ آپ ہی نے ــــــ اشرف علی کا غصہ ساری حدیں پار کر چکا تھا۔ انھوں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا ــــ کمینی ــــ چلی جا یہاں سے ــــ"

اُف ــــــ تم انسان نہیں ہو چھوٹے صاحب ــــ اور تم مرد بھی نہیں ہو ــــ اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی ــــــــــ"

اور اشرف علی خاں نے یہ آخری وار بھی سہہ لیا کیونکہ دراصل وہ اصل مرد تھے۔

بڑے کا سہاگن

بدلے کا سہاگ

تمام انتظام پورے ہو چکے تھے ۔ مردُلا کو دلہن بنایا جا رہا تھا۔ یوں اس شادی میں کوئی ہنگامہ نہ ہوا تھا، بس ایک رسم سی پوری ہو رہی تھی۔ پھر بھی جواں دلوں کی گرمی وقت اور موقع کہاں دیکھتی ہے۔ مردُلا کی سہیلیاں اور ساتھی چپکے چپکے کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ کر ہی رہے تھے ـــــ مگر مردلا ان سب باتوں سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں گم تھی۔ اس دنیا میں نہ کسی دُلہا کا تصور تھا، نہ کسی اڑن کھٹولے والے شہزادے اور پریوں کا ـــ اس کا ذہن تو وہاں بھٹک رہا تھا جہاں اس کا سب کچھ کھو گیا تھا ـــ اس کے باپ نریندر گپتا ایک معمولی آدمی تھے، سرکاری ملازمت کرتے تھے اور فورمین کا عہدہ بڑی عزت اور دیانت داری سے سنبھالے ہوئے تھے۔ چار بچے تھے۔ سب سے بڑی مردلا ہی تھی ـــ اس کے بعد دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ زندگی روکھی سوکھی کھا کر بڑے آرام سے گذر رہی تھی ـــ مردُلا ایم اے کر چکی تھی اور تینوں بچے بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مردلا جب سے بڑی ہوئی تھی بابا کا سکھ چین ختم ہو گیا تھا۔ جہاں سے بھی بیٹی کے رشتہ کی بات چلتی۔ لڑکے والوں کی مانگ پر آکر ختم ہو جاتی۔ اور گپتا جی نے اس بارے میں تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ انھوں نے اپنے بچوں کو بڑے ناز نخروں سے پالا تھا ان کے لیے زندگی کا اہم مقصد یہی تھا کہ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ان کی جمع پونجی تو یہی بچے تھے ـــ اب اتنا روپیہ کہاں سے لائیں کہ بیٹی کی شادی کریں ؟ جتنا اچھا لڑکا درکار ہو اس بازار میں اتنا ہی زیادہ پیسہ لگانا پڑتا ہے۔ مردلا جیسی خوبصورت، شریف، پڑھی لکھی سوشیل لڑکی کے لیے کم از کم اس کے برابر کا لڑکا تو ہو ـــــ بابا نے بہت جتن کر کے پیسہ جوڑنا شروع کیا ـــــ ہاتھ میں کچھ ہو تو کہیں شادی کی بات بھی کریں۔ دو سال میں بڑی مشکل سے بابا صرف دس ہزار کا ہی انتظام کر سکے۔ اس حقیر رقم سے کیا حاصل ؟

یوں شادی کی بات تو کئی جگہ چلی، لیکن یہ لڑکا جو بابوجی کے دفتر کے بڑے بابو ورما جی نے انھیں بتایا تھا، بابا کو بہت پسند تھا۔ اونچے خاندان کا پڑھا لکھا ایل ایل بی۔ وکالت میں کافی نام

کما چکا تھا۔ بابا کو ہر لحاظ سے پسند تھا۔ مسئلہ صرف جہیز اور نقدی کا تھا۔ جہیز کا انتظام کیسے اور کہاں سے ہوتا؟ بابا ہمت ہار چکے تھے۔ نہ وہ اتنا روپیہ اُدھار لے سکتے تھے، نہ کوئی لاٹری ہی نکل سکتی تھی ۔ کاش بات یہیں ختم ہو جاتی لیکن مردلا کی قسمت میں جب یہی بر لکھا تھا تو بات کیسے ختم ہو جاتی۔

ایک دن بابا نے پورے پچیس ہزار روپیہ کا بنڈل لا کر ماں کو دیا تھا اور کہا تھا میں نے لڑکے والوں سے ہاں کر دی ہے۔ شادی کی تیاریاں شروع کرو ــــــــــ"

یہ انتظام کہاں سے ہوا؟ ــــــــــ ماں نے بڑی حیرت سے پوچھا تھا ــــــ"

یہ نہ پوچھو ــــ سب کام ایشور ہی کرتا ہے اور ہاں ایک دو دن میں ہفتہ بھر کے لئے باہر جانے والا ہوں واپسی پر روپیہ اور دوں گا۔ فکر نہ کرو ــــ ہماری مردلا بڑی قسمت والی ہے تبھی تو اتنا اچھا بر ملا ہے۔

لیکن جا کہاں رہے ہو؟"

کان پور ــــــ دھرم کے یہاں" ــــــ یہ بابا کے سگے بھائی کا نام تھا۔ اور پھر بابا اپنے ایک بریف کیس کے ساتھ کان پور چلے گئے ــــ ماں کپڑوں کی خریداری، زیورات بنوانے اور شادی کی دیگر مصروفیات میں لگ گئی ــــ ایک ہفتہ پورا نہیں ہوا تھا کہ دفتر کے بڑے بابو ورما جی ہانپتے کانپتے آئے اور سب کو ٹیکسی میں بھر کر لے گئے۔ بابا اسپتال میں دم توڑ رہے تھے۔ تب یہ راز افشا ہوا کہ بابا کان پور نہیں، یہاں اسپتال میں بھرتی ہونے کو آئے تھے۔ وہ کیوں آئے تھے؟؟ بابا نے کسی ضرورت مند مریض کو پچاس ہزار روپیہ میں اپنا ایک گردہ بیچ دیا تھا۔ اور پچیس ہزار روپیہ کی رقم بطور ایڈوانس بابا کو مل چکی تھی۔ کام پورا ہونے پر پچیس ہزار روپیہ اور ملنے تھے، لیکن ایشور کو نہ بابو کی زندگی عزیز تھی نہ روپیہ۔ بات ایسے بگڑی کہ بنائے نہ بنی ــــ بابا اور وہ مریض دونوں ختم ہو گئے ــــ بڑے بابو، جو اس بات کے راز دار تھے رہ رہ کر ہاتھ مل رہے تھے۔ نہ بابا ہی بچے اور نہ باقی پچیس ہزار ــــ چالیس دن گذر گئے۔ سارے گھر کا انتظام چاچا جی نے سنبھالا ــــ اماں سے انھوں نے کہا تھا ــــ بھابی، جو ہو گیا سو ہم بھول نہیں سکتے۔ کاش مجھے پتہ چل جاتا تو ــــ میں بھیا کو ایسا کبھی نہ کرنے دیتا ــــ"

اب بھابی کیا بتائے کہ کیا وہ خود انھیں ایسا کرنے دیتی ــــ اسے تو خود ہی معلوم نہ ہوا۔

چاچا نے کہا تھا "بھابی بھیا نے مرڈلا کے لیے اپنی قربانی دی ہے۔ ہم سب کا فرض یہی بنتا ہے کہ وہ جو چاہتے تھے، پورا کریں ــــ مرڈلا کی بات جہاں بھیا پکی کر گئے ہیں، وہیں شادی ہو جائے تو اچھا رہے گا۔" تب اماں نے کانپتے ہونٹوں سے کہا تھا ــــ "لیکن" ــــــــ اشاروپیہ ــــــــ آپ کوئی چنتا نہ کریں بھابی سب ہو جائے گا ــــ"

اور یوں مرڈلا کی شادی کا دن آگیا تھا۔ اسے دلہن بنایا جا رہا تھا۔ سہیلیوں نے ٹہوکا دیا۔ کسی نے چٹکی لی ــــ اری کیا ہو رہا ہے تجھے ــــــ ابھی سے وہاں پہونچ گئی ــــــ ابھی تو تو یہیں ہے ہمارے پاس ــــ ابھی سے ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہے ــــ"

مرڈلا کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ خون کے دو قطرے اس کی پتھرلی ساکت آنکھوں پر جم کر رہ گئے۔ اس کی سب سے پیاری سہیلی انیتا نے اس کے میک اپ کو آخری ٹچ دے کر اسے زیورات سے آراستہ کیا اور بلائیں لیتے ہوئے بڑا سا شیشہ اس کے چہرے کے آگے کر دیا۔

دیکھ کیسا روپ نکھرا ہے تیرا مرڈلا۔

اس کی ساکت آنکھوں میں کچھ جنبش ہوئی ــــ اس نے خود کو آئینہ میں دیکھا۔ جگ مگ کرتے کپڑے۔ زیورات۔ ہار سنگار۔ افشاں ــ مہندی ــ سندور ــ چوڑیوں کا گہنا ــ مہندی کا رنگ ــ مٹا ــــ اسی آئینہ میں اُسے پیچھے سے ماں کا عکس نظر آیا ــ جو اسی کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی ــــ مجسم ہو گئی ــ اس نے پھر اپنا سراپا دیکھا ــ اور پھر ماں کو دیکھا ــ خالی مانگ ــ سونا ماتھا ــ ننگی کلائیاں ــــ سفید لباس ــــ اُجڑا چہرہ ــــ بے رونق آنکھیں دل پر جیسے پتھر کی سِل ــ وہ کانپ گئی ــــــ نہیں ــــــ نہیں ماں نہیں ــــــ مجھے یہ بدلے کا سہاگ ــــــــ نہیں چاہیئے ــــــ نہیں ماں نہیں ــــــــ میں جی نہیں سکوں گی ماں ــــ جی نہیں سکوں گی ــــ ماں میں کیسے جی سکوں گی ــــــــــ ؟؟

مرڈلا ماں کے بے جان بازوؤں میں بے ہوش ہو چکی تھی ــــــ

فرق

وہ ہمارے محلہ کا نیا کرایہ دار تھا۔ اکثر و بیشتر کہیں نہ کہیں اس سے مڈبھیڑ ہو ہی جاتی۔ بڑا وجیہہ بڑا خوبصورت۔ سانولا سلونا رنگ۔ بڑی بڑی بادامی مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ اونچا قد۔ چوڑے کندھے بالکل سیاہ بال، باوقار چال، عمر کوئی بیس پچیس سال ہوگی۔

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک بار نظر پڑ جائے تو دوبارہ نظر خود ہی اٹھ جاتی ہے اور جتنی بار بھی نظر اٹھے معلوم ہو کہ تشنگی اور بڑھ گئی۔ بس ایسا ہی کچھ تھا۔ وہ مجھے دیکھتا اور خفیف سا مسکرا دیتا۔ مجھے بڑی خوشی سی محسوس ہوتی۔ اتنی کہ میں کافی دیر تک سرشار رہتی ــــ اچانک وہ ایک دن میرے اسٹوڈیو ــــ جی ہاں ــــ میرا ایک فوٹوگرافی کا اسٹوڈیو بھی ہے، جسے میں ہی چلاتی ہوں۔ تو اچانک ایک دن وہ میرے اسٹوڈیو میں داخل ہوا۔ تھوڑا جھک کر گردن کو خفیف سا خم دے کر اس نے بڑے ادب سے مجھے آداب کیا۔

آؤ بیٹھو ــــ عطر شمامہ کا ایک جھونکا سارے اسٹوڈیوں کو مہکا گیا ــ اس کے آنے سے مجھے کس قدر خوشی کا احساس ہوا کیا بتاؤں ــــ؟ ایک عجیب سی مسرت میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔

یہ ایک فوٹو بنوانا ہے۔ اس نے جیب سے نگیٹو نکالتے ہوئے کہا ــــ

میں نے نگیٹو دیکھا ــــ کتنی کاپیاں چاہئیں ؟

تین کاپی پاسپورٹ سائز ــــ

ٹھیک ہے کل لے لیجئے گا۔

مجھے ابھی ضرورت ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے خوبصورت دانت چمکائے۔

ابھی ــــ؟ اچھا ــــ میں نے ارجنٹ فوٹو بنانے کی قیمت بتائی۔

ٹھیک ہے ! مجھے ضرورت ہے۔

میں نے ڈارک روم میں جا کر پانچ منٹ میں فوٹو تیار کر دیئے اور وہ شکریہ ادا کر کے دلفریب

سی مسکراہٹ بکھیر کر واپس چلا گیا۔

میں نے ایک طویل سانس کھینچی تاکہ وہ پیاری خوشبو جو وہاں وہ چھوڑ گیا تھا اپنے اندر سمو سکوں۔

اس دن کے بعد جب بھی جس موڑ پر بھی۔۔۔۔۔۔۔ اس سے سامنا ہوا وہ آداب کر کے مسکرانا نہیں بھولا۔

میں بھی بڑی خوش دلی سے مسکرا کر جواب دیتی اور خیریت پوچھتی۔

کہو کیسے ہو؟ کتنا اچھا لگتا ہے وہ مجھے میں سوچتی ہی رہتی۔

میں نے کبھی اس کا نام جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ جمیلہ آپا کا کرایہ دار ہے اور شاید مزید تعلیم حاصل کرنے کسی دوسرے شہر سے آیا ہوا ہے۔

جب چاہت نے زور پکڑا تو میں نے اپنا دل اپنے شوہر کے سامنے کھول کر رکھ دیا اور بتایا کہ جمیلہ آپا کے مکان میں نیا کرایہ دار ہے۔ کوئی لڑکا ہے۔ بہت پیارا سا ہے۔ بڑا بھولا بھالا۔ سانولا سا رنگ ہے بالکل ہمارے ٹاٹا جیسا ــــــ (یہ ہمارے دو سالہ بیٹے کا نام ہے) بڑی بڑی سی خوبصورت آنکھیں ہیں اور بڑا اسمارٹ ہے۔ کبھی دیکھا آپ نے؟؟ میں نے سوالیہ نظروں سے ان سے پوچھا۔

کہنے لگے کوئی دھیان نہیں دیا۔

ارے وہ تو سارے محلے کے لڑکوں میں دور سے ہی چمک جائے گا۔

دو چار دن بعد میں نے پھر پوچھا۔ دیکھا آپ نے اس لڑکے کو؟ کہیں ملا؟

انھوں نے پھر وہی جواب دیا۔

اگلے دن خود ہی انھوں نے بتایا کہ آج میں نے اسے دیکھا ہے۔

اسے کہتے ہی میں سمجھ گئی کسے دیکھا ہے۔

کیسا لگا؟ اچھا ہے نا؟ بڑی ادا سے مجھے سلام کرتا ہے۔ خاصا اسمارٹ ہے۔ میں کئی باتیں ایک ساتھ کہہ گئی۔

انھوں نے میرے لہجے اور خوشی کو محسوس کیا اور کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔

میں مسکرا رہی تھی۔ خوشی میری رگ رگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

ایک اتوار کی شام میں اپنے شوہر کے دل پسند پکوڑے بنانے کے بعد چائے بنانے کی تیاری میں

تھی کہ کسی نے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔

میں نے جاکر دیکھا وہ اپنی مخصوص ادا کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ایک کیمرہ اس کے کندھے پر جھول رہا تھا۔

آداب ـــــــ وہی دل فریب انداز ـــــ

آداب ـــــــ

کہو کیسے آنا ہوا ـــــ؟؟

آپ کا کچھ وقت ضائع کرنے آیا ہوں۔ کیا دے سکیں گی ؟

ہاں ہاں کیوں نہیں۔

یہ ایک کیمرہ خریدا ہے، ذرا اس کا سسٹم سمجھا دیجئے۔

آؤ اندر آؤ ـــــــ

میں اسے باہر لان میں لے گئی اور کیمرے کا سسٹم سمجھانے لگی۔ کتنی دوری سے کتنی روشنی میں کیسے فوٹو لینا ہے۔ کتنا اپرچر رکھنا ہے اور کیا ٹائمنگس رکھنی ہے اور کب فلش کا استعمال کرنا ہے وغیرہ وغیرہ ـــــ میں نے اس کے دو تین فوٹو لے کر اسے بتایا ـــــ

ایک ٹرائی میں بھی آپ کے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔

میں خاموش رہی اور یوں اس نے ایک تصویر میری بھی لے لی۔ میں نے اسے چائے پیش کی جو بڑی خوش دلی سے اس نے قبول کر لی۔ وقت گذرتا گیا اور تکلف کا پردہ کم ہوتا گیا۔ وقتاً فوقتاً وہ کوئی نہ کوئی جملہ میری تعریف میں دہراتا رہا۔ جیسے آپ بہت اچھی آرٹسٹ ہیں۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کوئی لیڈی پروفیشنل فوٹو گرافر نہیں دیکھی ـــــ آپ کافی اسمارٹ ہیں ـــــ آپ کی آنکھیں بڑی حسین ہیں ـــــ اور ایک دن میرے کھلے گیلے بالوں کی ایک لٹ پکڑ کر اس نے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا تھا ـــــ آہ ـــــ کتنا گہرا نشہ ہے۔۔۔۔۔۔ گرم گرم پکوڑے کھاتے ہوئے اس نے کہا تھا آپ بہت مزے دار پکوڑے بناتی ہیں۔ کہیں میں ہر شام نہ آنے لگوں۔

ہر شام نہیں صرف اتوار کی شام۔ اتوار کو ہماری چھٹی ہوتی ہے اتوار کی چائے تم ہمارے ساتھ ہی لیا کرو۔ لیکن اچھا یہ ہے کہ پکوڑے بنانے والی گھر والی کا بندوبست کر لو ـــــ کوئی ہے؟ ـــــ؟

دکھاؤ نہ مجھے ——؟

مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ سنجیدہ ہو گیا ہے۔ شاید اس کو یہ بات ناگوار گذری ہو —— یہ سوچ کر میں نے موضوع بدل دیا۔

اس نے اپنا نام احمر بتایا۔۔ اور یہ کہ وہ کاشی کا رہنے والا ہے۔

اس طرح وہ کبھی کبھی میرے گھر آنکلتا رہا۔

یوں تو ہر بیوی اپنے شوہر کو دوسرے سے مختلف و ممتاز پاتی ہے۔ لیکن اپنے شوہر کو اور شوہروں سے میں نے کچھ زیادہ ہی مختلف پایا۔ وہ بہت سنجیدہ اور باوقار انسان ہیں۔ بے انتہا سُلجھی ہوئی طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایک ٹھیراؤ ہے۔ وہ اتنی خوبیوں کے مالک ہیں کہ میں فخر کر سکوں۔ شادی شدہ چھ سالہ زندگی میں انھوں نے کسی بات پر کبھی مجھ سے بازپرس نہیں کی۔ حالانکہ اسٹوڈیو ہونے کی وجہ سے مختلف لوگوں سے میرا ملنا جلنا رہتا ہے۔ بہت مرتبہ انھوں نے اسٹوڈیو پر کسی نہ کسی کو آتے جاتے دیکھا۔ وہ ہر ایک سے بڑی خوش دلی سے ملتے ہیں۔

یا تو وہ مجھے بہت اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ یا وہ اپنی خاموش طبیعت سے مجبور ہیں۔ یا انھوں نے سوچا ہو کہ یہ باتیں روکنے اور سمجھانے کی نہیں ہوتیں یا یہ کہ وہ اس بارے میں کچھ سوچتے ہی نہ ہوں۔ یا پھر وہ بہت زیادہ سرد ہوں۔ ہم دونوں بہت پیار سے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر رہنے کا تصور ہم کر ہی نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کبھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا کہ یہ پڑوسی لڑکا کیوں آتا ہے بلکہ جب کبھی وہ آتا اور یہ موجود ہوتے تو اس سے بڑی اچھی طرح بات چیت کرتے۔ اب وہ ہمارے یہاں جب اس کا جی چاہتا بے روک ٹوک آجاتا۔ ایک دن تھک کر میں یوں ہی ذرا آرام کرنے کے لئے لیٹ گئی کہ میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے اپنے شانوں پر کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھی ۔۔۔۔۔۔۔۔ "

آآپ ۔۔۔۔۔ سو رہی ہیں؟؟ —— اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ چہرہ جذباتی ہو رہا تھا۔ نظریں نیچی تھیں۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ یہ احمر تھا۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔

کیا بات ہے احمر؟؟ —— "

میں آپ کو بہت چاہنے لگا ہوں۔

سچ ــــــ میں بھی تو تمھیں بہت چاہتی ہوں ــــــ

اس نے شرماتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا ــــــ

ٹاٹا ــــــ ٹاٹا ــــــ ٹاٹا ــــــ ٹاٹا ــــــ

میں نے اپنے بیٹے کو آوازیں دیں جو لان میں پڑوسی بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

ٹاٹا ــــــ ٹاٹا ــــــ اور میں اسے گود میں بھر کر اندر لے آئی۔

احمر ــــــ دیکھو اس کو ــــــ تم نے کبھی اس کو غور سے دیکھا؟ غور سے دیکھو ــــــ آنکھیں ــــــ بال، ہونٹ، رنگ، گالوں کی سرخی ــــــ چہرے کی بناوٹ ــــــ ہنستے ہوئے گالوں کے گڑھے ــــــ دیکھا تم نے ــــــ؟؟

ہوں! ــــــ لگتا ہے میرا بچپن ہے۔

ہوں ــــــ سمجھ گئے ــــــ اور مجھے لگتا ہے تم اس کی جوانی ہو ــــــ میرے بیٹے کی جوانی ــــــ گویا کہ میرا ٹاٹا جوان ہو گیا ہے۔ میں بھی تمہیں بہت پیار کرتی ہوں احمر ــــــ بہت ــــــ تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ میں نے ایک طویل سفر پلک جھپکتے میں طے کر لیا ہے۔" میری آنکھیں بھر آئیں اور خود بخود میرا ہاتھ اس کے سر پر پہونچ گیا۔

اللّٰہ میاں

بڑا ہی پُر فضا ماحول تھا۔ سورج اپنے سرخ لباس کے ساتھ افق کی گہرائیوں میں کھو چکا تھا۔ سرخ شعاعیں سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھیں۔ دور تک پھیلا ہوا چاندی کا پانی ان سرخ شعاعوں سے کسی دلہن کی طرح ہم آغوش ہو کر انھیں اپنے اندر سمونے کی کوشش کر رہا تھا۔

مچھیروں نے جال کھینچ کھینچ کر کنارے لگا لیا تھا۔ جال میں پھنسی چھوٹی بڑی مچھلیاں جھلمل جھلمل سے چمکتی صاف نظر آ رہی تھیں۔ پیڑوں کی چوٹیوں پر چمکتی ہوئی سرخ شعاعیں اپنا رقص پورا کر چکی تھیں اور تھک کر نیچے اتر رہی تھیں۔ بگلوں کی سفید قطاریں آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔

نسیم اپنے مکان کی دوسری منزل سے یہ سارا منظر کینوس پر اتارنے میں منہمک تھے۔ یہ ان کا مشغلہ تھا۔ وہ بہت اچھے آرٹسٹ تھے۔ اکثر قدرتی حسن کو رنگوں کے جادو سے کینوس پر سجایا کرتے تھے۔ اس دن بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ ان کے دونوں پیارے پیارے بیٹے کامران اور سبحان فٹ بال کھیلتے کھیلتے ان کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور حسب معمول کینوس کی رنگینیوں میں کھو گئے۔ "ابا امی تو کہتی ہیں ہر چیز اللّٰہ میاں دیتے ہیں۔ پیسے بھی اللّٰہ میاں دیتے ہیں اور ان کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا تو کیا ہم جو کچھ اللّٰہ میاں سے مانگیں گے وہ ہمیں دیں گے؟" یہ سوال نسیم کے بڑے بیٹے کامران کا تھا۔ جو نو برس کا تھا۔ اچانک اس سوال کے لئے وہ تیار نہیں تھے۔ پل بھر کے لئے وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ان کا تیزی سے چلتا ہوا برش رک گیا۔

"ہم کب سے اللّٰہ میاں سے پیسے مانگ رہے ہیں۔ اللّٰہ میاں دیتے ہی نہیں۔" یہ جملہ ان کے چھوٹے بیٹے سبحان کا تھا جو مشکل سے چھ برس کا تھا۔ نسیم کیا جواب دیتے۔ وہ خود ایک آرٹسٹ تھے۔ آزادانہ ماحول میں رہنے بسنے والے۔ وہ خدا کی ذات سے منکر نہیں تھے۔ لیکن اندھا دھند تقلید کے وہ قائل نہ تھے۔ ہمیشہ فوزیہ میں اور ان میں مذہبی باتوں پر تکرار ہوا کرتی تھی۔ فوزیہ مولوی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا ماحول کٹر مولویانہ تھا۔ بچپن سے جوانی تک انتہا پسندی کی جو چھاپ اس پر پڑی تھی، وہ اس سے باہر نہیں نکل سکی تھی وہ اکثر و بیشتر بچوں کو بھی اس کی ترغیب دیتی رہی تھی۔ بچوں کا ذہن کورا کاغذ ہوتا ہے۔

یہ بات فوزیہ کے زمانہ میں تو شاید درست ہو لیکن موجودہ دور میں نہیں۔

موجودہ دور میں بچوں کا ذہن وہ کاغذ ہے، جس پر نت نئے خاکے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں اور بچہ انھیں قبول کرنے نہ کرنے کی اہلیت خود رکھتا ہے۔ اسی لئے نسیم اس اندھی تقلید کے قائل نہ تھے، اور خاص کر بچوں کے معاملہ میں وہ مذہبی طور سے بہت محتاط تھے۔ انھیں اس وقت اپنی بیوی فوزیہ کی اس بے وقوفی پر افسوس ہو رہا تھا، وہ سوچ رہے تھے کہ بچوں کا اعتماد کس طرح واپس لائیں۔ دفعتاً انھیں ایک خیال گذرا۔

بیٹے، آپ پیسے ہم سے اور امی سے کیوں نہیں لے لیتے ؟

نہیں لیں گے " نہیں لیں گے " دونوں بچے ایک ساتھ ہو کر بولے۔

کیوں بھئی ۔ کیوں نہیں لیں گے ؟ "

امی پتنگ اڑانے کو منع کرتی ہیں۔ اس لئے وہ پتنگ کے لئے پیسے نہیں دیں گی۔ آپ بھی نہیں دیں گے کہ الابلا کھاتے ہیں۔ تبھی تو ہم اللہ میاں سے بڑی دیر سے پیسے مانگ رہے ہیں۔ چھوٹا بیٹا بڑی مایوسی سے بولا۔

نسیم کو جیسے بات کا سرا مل گیا۔ اوہ ! اب سمجھا۔ پتنگ اڑانے کے لئے پیسے چاہئیں۔ یہ کوئی اچھا شوق نہیں۔ تبھی تو اللہ میاں نے آپ کو پیسے نہیں دیئے۔ لیکن بچوں کو تو پیسے درکار تھے۔ اور وہ بھی اللہ میاں سے۔ پتنگ کے لئے ہوں ——— یا ٹافیوں کے لئے ——— یا آم پاپڑ کے لئے ———

نسیم کو بے ساختہ بچوں کے بھولے پن پر ہنسی آگئی۔ اور مسکراتے ہوئے بولے " ضرور آپ نے دعا میں کوئی غلطی کی ہوگی "۔

جاؤ نیچے آنگن میں جاکر پھر سے دعا مانگو۔ اور ہاں آنکھیں بند کر کے مانگنا۔ آنکھیں کھول کر مانگو گے تو اللہ پیسے نہیں دے گا اور جب آنکھیں بند کر کے دونوں بچے پیسے مانگ رہے تھے تو کھنک دار آواز کے ساتھ لڑھکتا ہوا ایک سکہ ان کے قدموں پر آگرا۔

دے دیئے ——— دے دیئے ——— اللہ میاں نے پیسے دے دیئے ۔ بچے خوشی سے اچھل اچھل کر چلا رہے تھے ۔

کیا ہوا؟؟ کیوں چلا چلا کر سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے " فوزیہ نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

ارے امی جان . . . . آج تو ہمیں اللہ میاں نے پیسے دے دیئے۔ آپ سچ کہتی ہیں۔ ہر چیز اللہ میاں سے مانگنی چاہیئے۔ بچے ماں کو ٹکہ دکھاتے ہوئے باہر بھاگ گئے۔ اور فوزیہ مورت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اب تو بچوں نے روزانہ یہی مشغلہ بنالیا۔ ماں باپ دونوں پریشان تھے۔ آخر نسیم نے دونوں بچوں کو سمجھایا کہ بیٹا زیادہ مانگنے سے تو اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے، سوچیں گے کہ یہ بچے بڑے گندے ہیں روزانہ کچھ نہ کچھ مانگتے ہی رہتے ہیں۔ پھر وہ آپ کو پیسے دینا بند کر دیں گے۔

دونوں بچوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور طے پایا کہ اچھا کبھی کبھی مانگا کریں گے۔ لیکن بچے تو بچے ہی تھے۔ جب اللہ میاں بنا کچھ کہے دیتے ہیں تو پھر کیوں نہ مانگیں۔ نسیم سوچ ہی رہے تھے کہ کسی دن بچوں کو یہ بات سمجھا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کریں گے۔ انھیں بتائیں گے کہ پیسہ کس طرح آتا ہے، کہاں سے آتا ہے اللہ کیسے دیتا ہے۔ دراصل بچے چھوٹے تھے اس لئے وہ اس بات کو تب تک ٹال دینا چاہتے تھے جب تک ان کا شعور بیدار نہ ہو جائے۔ ان کے اندر بات کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے۔ لیکن بچوں کی مانگ کو پورا کرتے کرتے وہ تنگ آگئے تھے۔ اس لئے اس مسئلہ پر وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے تھے۔

دونوں بچے کیرم کھیل رہے تھے اور نسیم بڑے غور وفکر سے بچوں کے ذہن کا جائزہ لے رہے تھے۔ کھیلتے کھیلتے بڑا بھائی کامران چھوٹے بھائی سے بازی ہار گیا۔ کھیل سے دل اچاٹ ہو گیا چھوٹے بھائی سجان سے بولا "چلو تپنگ لینے چلیں"۔ "تپنگ اڑائیں گے۔"

لیکن پیسے ؟؟ ــــــــــ چھوٹے بھائی سجان نے بڑے سوالیہ انداز میں بڑے بھائی کیطرف دیکھا۔

چلو ـــــ اللہ میاں سے مانگیں گے۔" کامران نے جواب دیا۔

سجان نے ڈرتی ڈرتی چور نگاہوں سے پہلے ابا میاں کو دیکھا پھر بڑے بھائی سے کہا۔" ابھی اللہ میاں اوپر نہیں گئے ہیں۔"

نسیم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ان کے ہاتھ سے رسالہ چھوٹ گیا۔ جسے وہ صرف پکڑے ہوئے تھے۔ ان کا دل پل بھر کو سینہ چیر کر باہر نکل پڑا ــــــ دوسرے ہی پل انھیں اطمینان اور سکون کا احساس ہوا، اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
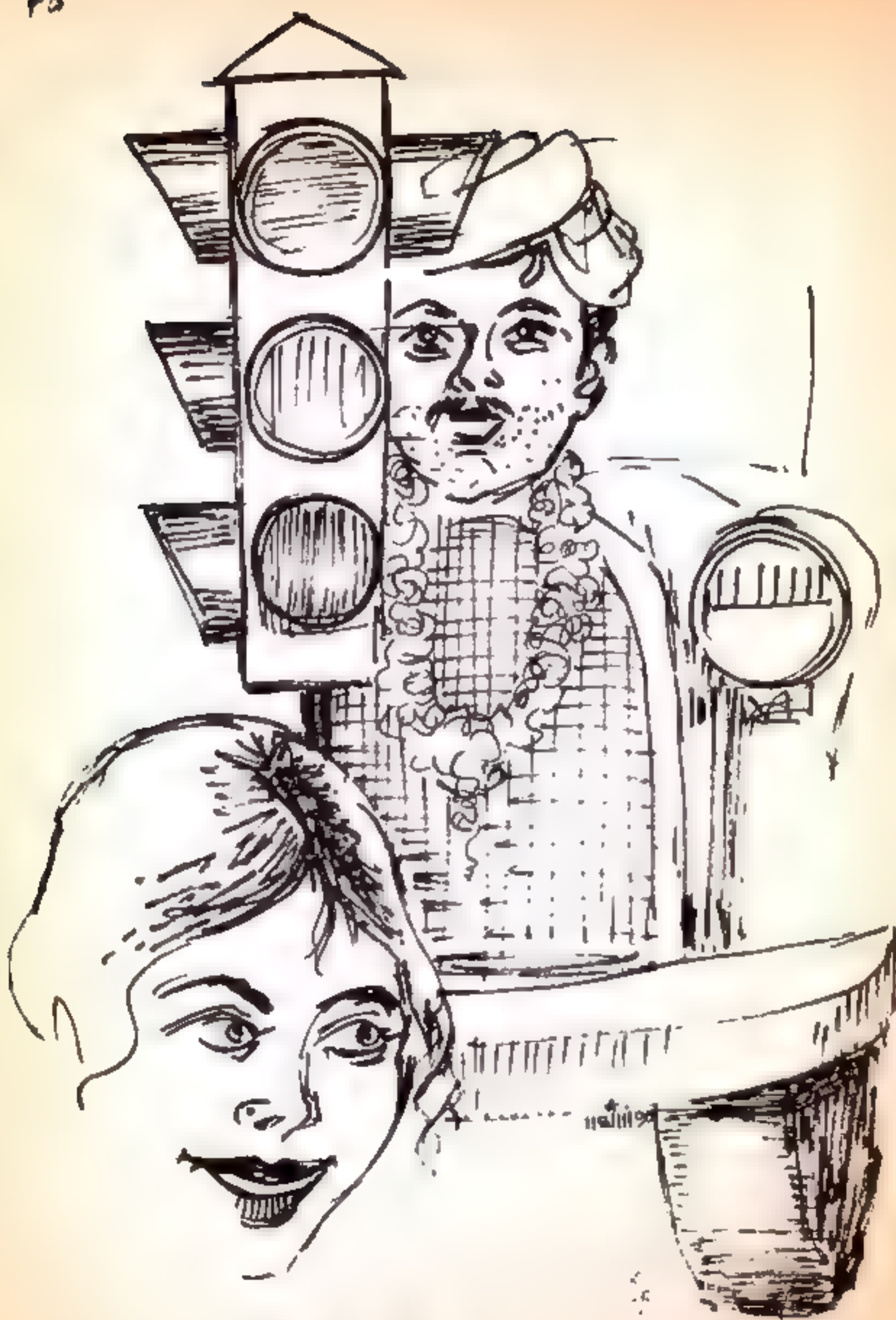
ریڈ لائٹ

"ریڈ لائٹ"

لاکھن نے پھولوں کی گٹھری فٹ پاتھ پر رکھی اور خالی خالی نظروں سے ریڈ لائٹ کو تکنے لگا۔
لیکن آج ریڈ لائٹ کو دیکھ کر اس کی بوڑھی آنکھوں میں نہ کوئی چمک پیدا ہوئی نہ خوشی۔ اس کی
چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے درد و کرب جھانک رہا تھا۔ چہرے پر گہری ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا

بوڑھا وجود اور زیادہ سمٹ گیا تھا۔

کل تک یہی ریڈ لائٹ اس کے لئے زندگی کا پیغام لاتی تھی، اس کی بوڑھی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرتی تھی۔

وہ ایک مالی تھا۔ اپنے چمن کے تمام تر پھول چن چن کر وہ مالائیں پروتا اور سویرے سویرے ہی اس فٹ پاتھ کے چوراہے پر آکر بیٹھ جاتا۔ ریڈ لائٹ چمکتی اور قطار در قطار ٹرک اور گاڑیاں جمع ہونے لگتے۔ اور لاکھن دوڑ دوڑ کر ہر ایک ڈرائیور کی طرف ایک ایک دو دو ہار اچھال کر خوش آمدید کہتا اور اس کے بدلے میں چار آنے چھ آنے آٹھ آنے اجرت وصول کرتا اور خوش ہو جاتا۔ گرین لائٹ ہوتی اور گاڑیوں کے غول کے غول پھر بھاگنے لگتے۔ پھر ریڈ لائٹ ہوتی اور پھر یہی کرم چلتا رہتا۔ جب تک کہ اس کے پھولوں کی گٹھری خالی نہ ہو جاتی۔

وہ بہت چھوٹا تھا تب سے اپنے باپو کے ساتھ اسی چوراہے پر آکر یہی کام دیکھا کرتا۔ اس کو چوراہوں پر جلتی بجھتی لال پیلی اور ہری بتیاں بڑی خوبصورت لگتی تھیں۔ ٹرک، گاڑیاں، اسکوٹر اور لمبی چوڑی کاریں، اس میں بیٹھی گڑیوں کی طرح سجی میمیں وہ بڑے چاؤ سے دیکھا کرتا۔ کتنی الگ تھی وہ دنیا؟ بڑی حسین، بڑی رنگین لیکن جلد ہی اسے اپنے باپ کا کام سنبھالنا پڑا۔ اس نے دیکھا اس کے باپ کو بھاگتے بھاگتے کھانسی آجاتی اور بے حال ہو جاتا تو اپنا سینہ پکڑ کر وہیں بیٹھ جاتا اور بڑی مایوسی سے دوڑتے بھاگتے ٹرک اور گاڑیاں دیکھتا رہ جاتا۔

دمے کی شدت سے اس کا سانس پھولنے لگتا تب پھولوں کی وہ رنگ برنگی لڑیاں خود اس نے تھام لی تھیں۔ چند سال بعد لاکھن اپنے کام میں اتنا مشاق ہو گیا کہ کوئی بھی ٹرک اور گاڑی اس کی نظروں سے نہ چوکتا۔

چند سال بعد اس کی شادی ہو گئی۔ بچے بھی ہوئے۔ باپ پرلوک سدھار گیا۔ دو بہنوں کی شادی بھی اسے کرنا پڑی۔ جیسے جیسے اس کے چمن میں پودوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ہی پھولوں کی تعداد بھی کیاریوں میں بڑھتی گئی۔۔۔۔۔۔۔ انھیں پودوں سے وہ اب کئی کئی گٹھر پھول اتار لیتا تھا۔ "وہ کہتا، ایشور بڑا کرپالو ہے آنے والے سے پہلے اس کے ان کا بندوبست کر دیتا ہے۔" اور یہی سوچ کر وہ اگلے بچے کی تیاری میں جٹ جاتا ہے۔

لیکن آہستہ آہستہ وہ ہمت ہارتا گیا۔ اسے بھی بھاگتے بھاگتے اپنے باپ کی طرح کھانسی کے دورے پڑتے اور سانس پھول جاتا۔ بچے سب چھوٹے چھوٹے۔ بڑی بیٹی لاجو بارہویں سال میں، دوسری گیارہویں سال میں، تیسری دسویں سال میں پھر دو بیٹے اور گود میں چھوٹی بیٹی ———— بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر بھی اسے دن رات کھائے جاتی۔ ویسے بھی بیٹیوں کے باپ کو بڑھاپا جلدی ہی چھونے لگتا ہے اور پھر اس پر خستہ حالی — — — — —

مجبور ہو کر اس نے اپنے ساتھ اپنی بیٹی لاجو کو لانا شروع کیا۔ زندگی پھر معمول پر آ گئی۔ دن روکھی سوکھی کھا کر اطمینان سے گذرنے لگے۔

یکایک اسے محسوس ہوا کہ اس کے پھولوں کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے کئی بار اس کا دل اُچھل کر حلق تک آیا جب ریڈ لائٹ پر جا کر کچھ دیر تک اس کی بیٹی اسے نظر نہ آتی۔ وہ اُچک اُچک کر اپنی چندھیائی آنکھیں چوراہے پر دوڑاتا رہتا۔ جب تک کر چلانگیں لگاتی، چوکڑی بھرتی بیٹی کو آتے ہوئے نہ دیکھ لیتا۔

لاجو پر دل و جان نچھاور کرنے والے ڈرائیوروں میں سے ایک شامو بھی تھا۔ پھولوں کا بے انتہا رسیا چاہے وہ پھول جنگلی ہوں یا کسی چمن کے، کیچڑ کے ہوں یا کسی نالے کے۔ "وہ کہتا: "پھول تو پھول ہی ہیں۔" مدت سے وہ لالہ رتی لال آڑتی کے یہاں ڈرائیور تھا اور ہر روز ساگ سبزیوں کا بھرا ٹرک اسے آڑت پر پہونچانا ہوتا تھا۔ مالیوں کا یہ انداز اسے بے حد پسند تھا کہ سویرے سویرے ہی تازہ پھولوں کا تحفہ وہ ہوا میں لہرا کر اس تک پہونچا دیتے۔ وہ کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کر بڑی مشاقی سے ہار کو لپک لیتا اور ہار ٹرک کے بجائے شامو کے گلے میں جھولنے لگتا۔ جب سے اس نے لاجو کو اس فٹ پاتھ پر دیکھا تھا، تب سے پھولوں میں اس کی دلچسپی اور بڑھ گئی تھی۔ ایک دن اس نے لاجو کو بڑے پیار سے پکارا۔

ادھر آ — — — — — —

کیا بابوجی ———— بولو ————

اری اِدھر اوپر آ ———— ایک ہار اور لیتی آ میرے بھگوان کی تصویر پر چڑھانے کے لئے۔ اور پیسے بھی لیتی جا ———— ذرا جلدی آ ————

لاجو جھٹ چلانگ لگا کر ٹرک پر چڑھ گئی۔

بھوانی کی تصویر کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ ہار چڑھانے ہی والی تھی کہ ٹرک چل پڑا ـــــ روکو

بابوجی روکو ـــــ روکو ـــــ مجھے اتر جانے دو ـــ ـــ

شامو نے ایک زنانٹے سے سڑک پار کی اور ٹرک کنارے لگا دیا۔ لاجو کودنے ہی والی تھی کہ شامو نے ہاتھ پکڑ لیا۔ لاجو گھبرا گئی۔ کیا بابو جی ؟ ـــ ـــ کچھ نہیں ـــ ـــ پگلی ـــ ـــ اری پیسے تو لیتی جا ـــــ اور شامو نے پانچ کا نوٹ لاجو کے ہاتھ میں تھما دیا۔

باقی پیسے نہیں۔ کھلے دو بابو جی ـــ"

"بھگوان پر چڑھایا ہے نا؟ " اور میرا بھگوان بڑے دل والا ہے۔" جا لے جا ـــــ"

لاجو ایک جھٹکے میں ٹرک سے کود کر یہ جا وہ جا۔ باپو کے ہاتھ میں پانچ کا نوٹ رکھتے ہوئے لاجو نے ساری بات بتا دی ـ ـــ ـــ ـــ

خوشی، غریبی اور لاچاری کے ملے جلے تاثرات لاکھن کے بوڑھے چہرے سے عیاں ہوئے لیکن چہرے پر پڑی جھرّیوں کی زد میں آگئے۔

اس نے یوں کہہ کر خود کو تسلی دی "جلد ہی لاجو کا بیاہ رچا دوں گا"

دن گذرتے گئے۔ لاجو نڈر ہوتی گئی۔ لاجو کی جوانی یا پانچ روپیہ کے نوٹ نے اسے نڈر بنا دیا تھا۔

بابو جی بھگوان کی مورتی پر ہار چڑھا دوں ؟؟

یہ بھی پوچھنے کی بات ہے ؟ شامو مسکرا کر کہتا ـــــ جیسے لاجو نہ سمجھ پاتی۔ وہ جھٹ ٹرک میں چڑھ جاتی بابو جی کے بڑے دل والے بھگوان پر ہار چڑھاتی ایک بار شامو کو کنکھیوں سے تکتی اور کود کر بھاگ آتی۔ اگر کبھی ٹرک چل پڑتا تو وہ گھبراتی نہیں کیونکہ چوراہا پار کر کے شامو ٹرک کنارے لگا دیتا اور وہ اتر جاتی۔ ایک ایک دو دو کے نوٹوں کی تعداد اب بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

لاکھن نے لاجو کی سگائی کر دی تھی اور بیاہ کے لئے پیسے جمع کر رہا تھا۔

اس دن لاجو خوب سج دھج کر باہر نکلی تھی۔ بھیا دوج کا تہوار تھا نا؟ ؟ کسی کسی چولی۔ جوانی کے نشیب و فراز سے بے نیاز گوٹا لگی اوڑھنی۔ پنڈلیوں کو چھوتا ہوا لہنگا۔ لہراتی ہوئی لمبی سی چوٹی۔

اے ـــــ" ادھر آ ـــــ" تین ہار تو لے آ" ـــــ

لائی بابو جی ـــــ اور لاجو لہنگا سنبھالتی ہوئی ہار لئے جھٹ سے ٹرک کے اندر ـــــ

بھوانی کی مورتی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ ہار چڑھایا ــــــ سگنل بدل گیا ــــــ اور
پل بھر میں جیسے شامو کا دل بھی بدل گیا ــــــ

بھگوان کی مورتی پر ہار چڑھاتے چڑھاتے لاجو اپنے باپو سے ہزاروں میل دور شامو کے دیس
پہنچ گئی۔ اس دن شامو نے اس کی کوئی منت سماجت نہیں سنی ــــــ

بوڑھا لاکھن ابھی تک لائٹ کی طرف چندھیائی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے اسے جھنجوڑا۔ "باپو باپو
لال بتی ــــــ" اور لال بتی اور ہری بتی کا فرق نہ سمجھتے ہوئے بھی لاکھن نے پھولوں کے
لڑیاں اب اپنے بیٹے کو تھما دیں ــــــ

"بابا"

"کوئی نیا مال"؟

شبیر خاں نے دارو کی بوتل لیتے ہوئے نکٹے کی بیوی چھمی سے پوچھا۔

"ہاں" کیوں نہیں "۔ لیکن شام کو آنا اس بخت لالہ نہیں ہے"

لالہ نے دس سال پہلے اس چھوٹے سے شہر میں دیسی دارو کی ایک چھوٹی سی بھٹی کھولی تھی۔ اس کی بیوی چھمی تندور پر روٹی اور چھوٹے چاول بنا کر کھانے کا بندوبست رکھتی تھی، اچھی خاصی بھیڑ اور ہنگامہ رہتا تھا۔

ایک دن کسی سرپھرے شرابی سے لالہ کا جھگڑا ہو گیا اور اس جھگڑے میں اُسی شرابی نے لالہ کی ناک کاٹ دی تھی تب سے وہ نکٹے کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ کام چل نکلا اور چلتے چلتے اتنا چلا کہ وہ چھوٹی سی بھٹی، بھٹی نہ رہ کر ہر طرح کی دیسی بدیسی شراب کی دوکان ہو گئی تھی۔ ہوٹل بھی اب دوسری شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ لالہ کو کوئی ایسا پارٹنر بھی مل گیا تھا جس نے شراب کے ساتھ ساتھ شباب کا دھندہ بھی سکھا دیا تھا۔ اب لالہ کے یہاں پیسہ برس رہا تھا۔

شبیر خاں جب سے اس شہر میں آیا تھا وہ پچھلے پورے آٹھ برسوں سے لالہ اور پھر نکٹے کو جانتا تھا۔ اس نے لالہ کے یہاں کا ہر طرح کا نشہ چکھا تھا۔

شبیر خاں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا خود کو فٹ پاتھ پر پایا تھا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔ کبھی بدمعاشوں میں تو کبھی شرابیوں میں۔ کبھی چوروں میں تو کبھی جواریوں میں۔ یہی ٹھکانے بدل بدل کر وہ جوان ہوا تھا۔ اور اب پکی عمر کو پہونچ چکا تھا۔

دھندے اس نے بھی بہت کئے۔ پاپڑ اس نے بھی بہت بیلے لیکن اپنی قسمت کا لکھا نہ بدل سکا۔ اسے چالیس برس پہلے کی وہ رات آج بھی یاد تھی جب وہ صرف چھ برس کا تھا اور

اپنی ماں کی ٹرک سے کچلی لاش کو لپٹ لپٹ کر چیخ رہا تھا اس کے بعد کوئی عزیز اسے اپنے گھر لے گیا جن سے اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ یامر خاں ایک شرابی آدمی تھا۔ ماں نے اس کی زیادتیوں سے تنگ آ کر علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ شبیر کو اپنے باپ سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ تب سے اس نے اپنا گھر اپنا شہر سب کچھ چھوڑ کر نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔

باپ کی شفقت، ماں کی ممتا، بہن بھائیوں کا دُلار اس کے لئے ایک بے معنی سی چیز تھی، اس نے دوسروں کے جوتے لات اور گالیاں سہہ سہہ کر ہی آدھے پیٹ روٹی کھائی تھی۔ محنت مزدوری سے وہ کبھی گھبراتا نہیں تھا لیکن وہ جتنی محنت کرتا اس کی اجرت بھی اس کو کبھی موصول نہ ہوتی تھی۔ ہوٹلوں پر کام کئے، جوتوں پر پالش کی، ٹھیلے بھی گھسیٹے لیکن وہی آدھے پیٹ روٹی ——— بے ایمانی، چوری چکاری، جوا کم از کم پورے پیٹ روٹی اور ساتھ میں دارو ——— کچھ تو ملتا ہی ہے۔

اور یوں وہ اپنے راستہ سے بھٹک گیا۔

کیوں محنت کرے؟ کس کے لئے کرے؟ لیکن اب عمر کا کچھ تقاضہ، کچھ تجربہ کا اثر پچھلے دس سال سے اس نے بدمعاشی کے تمام اڈے چھوڑ دیے تھے۔ اور پھر لالہ کے یہاں اسے پیٹ بھر روٹی شراب اور شباب، سب کچھ میسر ہو جاتا تو پھر جگہ جگہ منہ مارنے سے کیا فائدہ ؟؟ ———

رکشا چلاتا، چھوٹی موٹی مزدوری کرتا اور ٹھاٹ سے رہتا ———

کچھ دنوں سے اس نے کام میں ایسا ہاتھ جمایا تھا کہ بس بیٹھے بیٹھے کھاتا اور عیش کرتا کیونکہ اب خود اس کے کئی رکشے کرائے پر چلنے لگے تھے۔ کوئی پرانا ساتھی مل جاتا اور زیادہ زور دیتا تو وہ کسی لمبے پروگرام پر نکل جاتا لیکن واپس پھر وہیں آ جاتا شبیر خاں ۲ ماہ کا لمبا دورہ کر کے آیا تھا اور جیب بھر کر لایا تھا۔ شراب اور شباب دونوں کی ضرورت تھی۔ جھٹ پٹا ہوتے ہوئے شبیر خاں نکٹے کی دوکان پر پہنچ گیا۔

نکٹے نے دور سے ہی سلام مارا۔ پرانی جان پہچان اور یوں بھی شبیر خاں منہ مانگے دام سے کچھ زیادہ ہی دے کر اس کو خوش کر دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ نکٹے کو اس وقت خود اس جیسے گھسے منجھے اچھے گاہک کی تلاش تھی، کیونکہ پچھلے دو ہفتوں سے وہ کافی پریشان تھا۔ اپنی ساری جمع پونجی کو لگا کر اس نے ثمینہ کو خریدا تھا اور ابھی تک ایک پیسہ بھی وصول نہیں ہوا تھا الٹا اس کی دوکانداری کو

نقصان ہو رہا تھا۔ اس کے کئی گاہک بگڑ کر جا چکے تھے۔ سب کا کہنا تھا کہ وہ لڑکی کسی کے قبضہ میں آتی ہی نہیں۔ اس کو رام کرنے کے لئے شبیر خاں سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا، وہ تو اس میدان کا پکا کھلاڑی ہو چکا تھا۔

نکٹے نے شبیر کی بڑی آؤ بھگت کی اور رازدارانہ انداز میں سب کچھ سمجھایا۔ شبیر خاں نے اطمینان دلایا کہ وہ جیسا چاہتا ہے ہو جائے گا۔ اس کے لئے یہ کوئی بڑا کام نہ تھا وہ تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے تھا اس کے بال صرف دھوپ میں سفید نہیں ہوئے تھے۔

دوسرے دن شبیر خاں نے ثمینہ کے کمرے پر ہولے سے دستک دی۔ کوئی آواز نہیں۔ پھر ہولے سے دوبارہ دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ وہ اوپر سے نیچے تک دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجسم حسن۔ اداس اور خاموش۔ تصویرِ غم۔ ایسا معصوم حسن اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ صاف شفاف نہایا ہوا جسم، ہلکے آسمانی رنگ کا ہلکا سا سوتی سوٹ، فرش کو چھوتا ہوا بڑا سا آنچل۔ لمبے بالوں سے ٹپ ٹپ ٹپکتے شبنمی قطرے۔ کنگھا ہاتھ میں لئے وہ حیران کن نظروں سے ایک ٹک اسے گھورے جا رہی تھی۔ جیسے مدت بعد کوئی خواب دیکھ رہی ہو ـــــ یا پھر مدت بعد کسی خواب سے جاگی ہو ـــــ اسے محوِ حیرت دیکھ ـــــ شبیر خاں خود آگے بڑھا اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ ـــــ

ثمینہ نے اپنے گیلے بالوں کو پیچھے جھٹکا دیا۔ کنگھا ایک طرف رکھا اور دور فرش پر بچھے قالین پر گھٹنے موڑ کر بیٹھ گئی۔ بالوں سے ٹپکتے قطرے تیز تیز قالین میں جذب ہونے لگے۔ یہاں تک کہ پانی سوکھ گیا لیکن اس کی آنکھوں کی جل دھارائیں بدستور بہ رہی تھیں۔

شبیر خاں سگریٹ کا پورا پیکٹ پھونک چکا تھا، ثمینہ نے ایک نظر بھی اس پر نہیں ڈالی تھی اور وہ بھی ثمینہ سے کچھ نہ بولا تھا۔ گھنٹہ بھر خاموش بیٹھ کر وہ واپس آ گیا۔

نکٹے نے چمکتی آنکھوں سے شبیر سے سوال کیا۔

کچھ کام بنا ؟ ؟ ـــــ

بن جائے گا ـــــ شبیر خاں نے ہولے سے جواب دیا۔ کل پھر آؤں گا، تب تک کوئی اور نہ جائے ـــــ

سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔ کہہ کر نکٹے نے شبیر خاں کی بات کی تائید کی۔

اس رات شبیر خاں سو نہ سکا۔ یہ بات نہیں کہ لڑکی اس کی زندگی میں پہلی بار آئی تھی۔ ماں کا تو دھندلا سا ہی عکس اس کے دماغ میں محفوظ تھا۔ اس کے علاوہ جب جب عورت کا روپ اس نے دیکھا، بازاری ہی نظر آیا۔ بازاری بناؤ سنگار، بازاری لباس، بازاری باتیں، اسے ہر عورت ایک جیسی ہی نظر آتی۔ اس کے دل میں بارہا اپنا گھر بسانے کی خواہش نے جنم لیا تھا۔ لیکن انھیں بازاری عورتوں کو دیکھتے دیکھتے اس کی طبیعت اوب چکی تھی۔ اس لڑکی کے بارے میں بہت کچھ سوچ کر بھی شبیر خاں کچھ نہ سوچ سکا۔

دوسرے دن شبیر خاں پھر ٹکیٹے کے اڈے پر پہونچ گیا ـــــ ایک کپ چائے پی، دو چار گپ شپ ماریں اور ترو تازہ ہو کر وہ پھر شمینہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ بستر پر دراز چت لیٹی چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ فوراً اٹھ بیٹھی ـــــ شبیر خاں نے وہیں کھڑے کھڑے مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا ـــ ـــ ـــ فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی ـــ بابا ـــ ـــ ـــ ـــ وہ دوڑ کر شبیر خاں سے لپٹ چکی تھی۔ ماحول میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ پل بھر میں وہ سب کچھ ہو گیا تھا جو شبیر خاں کے لئے ساری زندگی بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ساری فضا سارے در و دیوار اب بھی وہی ایک لفظ بار بار دہرا رہے ہیں۔ بابا ـــــ بابا ـــــ بابا ـــــ جیسے اس کے خون کا ذرہ ذرہ اور جسم کا رواں رواں وہی ایک لفظ دوہرا رہا ہے۔ بابا ـــــ بابا ـــــ بابا ـــ اب اسے یقین ہو رہا تھا کیسے صرف ایک لفظ سے زندگیاں بن جاتی ہیں اور بدل جاتی ہیں۔ اس ایک لفظ سے اس کے جسم میں ارتعاش پیدا ہوا، وہ لفظ جو وہ ساری زندگی نہ سن سکا تھا، اس کی لذت کا اندازہ اس وقت اسے محسوس ہو رہا تھا۔ شمینہ اس کے بازوؤں میں سمٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا پتھر دل کس طرح پگھل کر اس کی آنکھوں سے بہہ گیا ہے۔

روتی کیوں ہو ـــــ شبیر خاں نے اس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

ـــ میں بار بار لٹی ہوں بابا" ـــــ لیکن اب لٹنا نہیں چاہتی " ـــ اس وقت میں چھوٹی تھی! کم ہمت تھی! اب میرا شعور جاگ چکا ہے، یہ چھ سال پہلے کی بات ہے جب میں چھٹی کلاس

پاس ہو کر ساتویں میں آئی تھی، گرمیوں کے دن تھے۔ میں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔ شہر سے بھائی اور بھابی آئے ہوئے تھے۔ وہ جاتے وقت چھٹیاں گزارنے مجھے بھی اپنے ساتھ شہر لے گئے اور یوں میں شہر پہنچ کر وہاں کی رونقوں میں کھو گئی۔

اچانک ایک دن مجھے شدید بخار چڑھا، بھائی دفتر گئے ہوئے تھے۔ بھابی کی گود میں صرف سات دن کا ننھا سا بچہ تھا، میری بخار میں یہ حالت دیکھ کر انھوں نے گھر سے پہلی گلی اور پھر دوسری گلی کے موڑ پر ڈسپنسری کا راستہ بتایا۔ میں وہ سرکاری ڈسپنسری ڈھونڈتے ڈھونڈتے تین اجنبیوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ جو مجھے زبردستی لمبی چوڑی کار میں ڈال کر نہ جانے کہاں لے گئے۔ اپنے بچاؤ کی میں نے بہت کوشش کی لیکن سب بے سود ——— کیسی کیسی اذیتیں میں نے برداشت کی ہیں یہ میری روح جانتی ہے۔ میری ماں روتے روتے مر گئی ہو گی ——— میرے بھائی اور بھابی ——— وہ پھر ہچکیاں لے کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی گئی ——— اب میں کیا منہ لے کر گھر جاؤں گی؟ ——— اس سے تو مر جاؤں تو اچھا ہے ——— اب یہ سب مجھ سے نہیں ہو گا۔ —— بابا ——— ذرا سا آسرا دے دو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں ——— کام کروں گی مزدوری کروں گی ——— سب کچھ کروں گی، یہاں سے نکال لو بابا ——— مجھے لگتا ہے تم ضرور مجھے بچا لو گے بابا ——— میری مدد کرو ——— اور وہ روتے روتے شبیر خاں کے پاؤں میں گر گئی اس نے اپنے تصور کے بابا کے پاؤں پکڑ لئے اور آنسوؤں سے دھو ڈالے۔

شبیر خاں کو لگا جیسے ان آنسوؤں سے اس کے سارے گناہ دُھل گئے ہیں۔

دو ماہ کے دورے پر شبیر خاں نے جو کچھ کمایا تھا وہ اتنا زیادہ نہیں تھا اس نے اپنی ایک رکشا بیچی اور تمام پونجی جمع کر کے نکٹے کے ہاتھ پر رکھ کر شمینہ کو خرید لیا۔

نکٹے نے صبر کیا چلو رقم واپس مل گئی۔ اسے تو اپنی ساری رقم پر پانی پھرتا نظر آ رہا تھا۔

شمینہ کے آجانے سے شبیر خاں کی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا تھا اس نے سارے بُرے کام چھوڑ دیئے تھے ایمانداری سے جو کچھ کماتا لا کر شمینہ کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ شمینہ ہر طرح کا خیال بابا کا دل و جان سے کرتی تھی اس کے آجانے سے گھر کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ ایک دن خوشی سے لبریز چھلکتی آنکھوں سے شبیر خاں نے شمینہ سے کہا: ”ایک اچھے لڑکے سے تیری شادی طے کر دی ہے۔“ ”میں پھر اکیلا رہ جاؤں گا روٹی کون کھلائے گا؟“ ——— لیکن بیٹی تیرے بابا کا فرض یہی تھا ———

میرا ملک میرا گھر میرے بچے

میرا ملک، میرا گھر، میرے بچے

"اللہ داد فخرالدین کا ٹ ـــــــــ اللہ داد فخرالدین کا ـــــــ

تہاڑ جیل کا جمعدار چلائے جا رہا تھا"

بیرک نمبر چار میں روٹی کھاتا ہوا اللہ داد چونک گیا۔ "اس کا نام کیوں پکارا جا رہا ہے" ؟ آخر کیا ہو سکتا ہے" ؟ وہ تو کسی سے لڑا بھی نہیں ـــ روزانہ کام پر بھی جا رہا ہے۔ کل تو کوئی بات ایسی بھی نہیں ہوئی جس سے آج اسے پکارا جا سکے۔

"ہاں جمعدار صاحب" ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

"ہاں بھئی اللہ داد بڑے صاحب کے یہاں پیشی ہے۔

"وڈے صاحب کے" ؟ اللہ داد گھبرا گیا۔ سالی یہ کیا مصیبت آئی سویرے سویرے

اللہ داد بڑبڑایا۔ اچھا روٹی کھا کر آتا ہوں"

گیٹ پر جانے کے لئے جب اللہ داد چکر پر آیا تو اسے رحیم خاں دکھائی دیا۔ اس نے لپک کر اسے روکنا چاہا لیکن وہ بھی گیٹ کی طرف ہی جا رہا تھا۔ اس نے پکارا۔

"اوے رحیمے ـــــ کتھے جان لگا رے"

"تینوں نئی پتہ" ؟ "وڈے صاحب نے بلایا رے" رحیم خاں بولا۔ پھر دونوں گیٹ کی طرف چل دئے۔

اللہ داد کو ڈیڈی کی یاد بری طرح ستانے لگی۔ اگر ڈیڈی مل جائے تو ساری بات پتہ لگ سکتی ہے چھوٹے سے قد کا یہ عمر قید کا قیدی جس کو سب ڈیڈی کہتے تھے، افسران اور قیدیوں کے درمیان کا پل تھا جس کی ہمدردیاں اور وفاداریاں دونوں طرف ہی تھیں۔ ایسے اڑے بھڑے وقت میں وہ اکثر قیدیوں کے کام آتا رہتا تھا۔

اللہ داد یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پھاٹک پر ڈیڈی اپنے سفید کھدر کے کپڑوں میں کھڑا بدستور اپنے

قیدیوں کی حاضری لے رہا تھا جو آج عدالت میں پیش ہونے والے تھے، انھیں دیکھتے ہی وہ بولا ــــ

اللہ داد فخرالدین کا ـــــــــ رحیم خاں کریم خاں کا ادھر آؤ ـــــــــ

ڈیڈی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھتے ہوئے اللہ داد کو کچھ اطمینان سا ہوا۔

چلو بڑے صاحب کے کمرے میں : تمھاری چھٹی کے دن قریب آرہے ہیں۔

کیا ؟ ـــــ اللہ داد کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا ـــــ رحیم خاں بھونچکا سا ہوکر اسے دیکھنے لگا۔ پھاٹک کے سوراخ میں سے ڈیڈی نے اندر کے سنتری سے کھڑکی کا دروازہ کھولنے کو کہا۔ وہ تینوں کھڑکی سے نکل کر صاحب کے کمرے میں آگئے۔

گڈ مارننگ سر۔

"ہیر از اللہ داد سن آف فخرالدین۔ اینڈ رحیم خاں سن آف کریم خاں بوتھ آف دیم آر پاکستانیز"۔

بڑے صاحب نے فائل سے نظریں اٹھا کر دونوں کی طرف دیکھا۔

تمھارا نام ؟ ـــــ"

اللہ داد ولد فخرالدین، موضع جلال پور ضلع لائل پور پاکستان ہوں :

اور تمہارا نام ؟ ـــــ"

رحیم خاں ولد کریم خاں موضع کرشن پورہ ضلع لائل پور پاکستان ـــ

کب آئے تھے "؟ صاحب نے پوچھا۔

"سن ۱۹۶۵ء میں" ـــــ

کس جرم میں ؟ ـــــ"

بارڈر پار کرنے کے۔

اور تم اللہ داد ولد فخرالدین کا ؟ ـــــ

"میں بھی اسی جرم میں اور اسی سال میں آیا تھا صاب"؛

تم دونوں کے کاغذات تصدیق ہوکر لاہور سے واپس آگئے ہیں کچھ دنوں میں جب اور لوگ جمع ہو جائیں گے تم کو لاہور بھیج دیا جائے گا۔

آپ کی بڑی مہربانی ہوگی صاب۔ اللہ داد نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا چلو اب جاؤ اپنے اپنے کاموں پر۔ ڈیڈی نے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سر وہ تھوٹ دیم ہیو بین گڈ ورکر ________"

نتھنگ اون ریکارڈ ________"

او کے "________ لیٹ دیم گو ناؤ۔ صاحب نے پھر فائل پر سر جھکا لیا ________"

اللہ داد کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ سوچتا رہا کہ اس نے کس طرح یہ سات سال گذارے ہیں محنت کرتے کرتے اس کے بازو شل ہو گئے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ وہ پہلے محنت نہیں کرتا تھا پہلے وہ اس سے بھی زیادہ محنت کرتا تھا لیکن دن بھر کی تھکان کو وہ اپنے بیوی اور بچوں میں بیٹھ کر بھول جاتا تھا لیکن اب اس تھکان سے اس کی زندگی تھک گئی تھی۔ سات سال کے سارے واقعات اس کے ذہن کے دریچوں سے جھانکنے لگے۔

وہ کھیت میں بیٹھا روٹی کھا رہا ہے، اس کا بیل گھومتے گھومتے کھیتوں سے باہر نکل گیا ہے جب اسے اس بات کا دھیان آیا تو وہ اپنے بیل کے پیچھے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے وہ اپنے ملک کا بارڈر پار کر گیا چند سپاہیوں نے اس کو پکڑ لیا۔ اور پکڑ کر پولیس چوکی لے گئے۔

آہ .... ایک کرب ناک گھٹی سی سسکی اس کے منہ سے نکلی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسے کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ پولیس چوکی پر اب بھی اس کی پٹائی ہو رہی ہے۔ پولیس والے اس سے سوال و جواب کر رہے ہیں۔ کوئی صفائی پیش نہ کرنے پر اس پر کوڑے برسائے جا رہے ہیں۔ پھر اس کو رسی سے باندھ کر ڈال دیا گیا ہے، وہ پانی پانی کرتے کرتے بے ہوش ہو گیا ہے۔ پیاس کی شدت سے اس کی زبان باہر لٹک گئی ہے، اس نے لاکھ منتیں کی تھیں کہ وہ اسے چھوڑ دیں، وہ کوئی جاسوس نہیں ہے، کوئی کالا دھندہ کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی دھوکہ باز نہیں۔ وہ تو صرف انجانے میں ایک بیل کا پیچھا کرتے کرتے ادھر نکل گیا۔ لیکن اس کی کسی نے ایک بھی نہ سنی۔ جب وہ پٹتے پٹتے ادھ مرا ہو گیا تو تین دن بعد اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہاں بھی اس پر سوالوں کی بوچھار ہوئی تھی اور جو صفائی میں اس نے کہا وہ وہاں

بھی بے کار ثابت ہوا۔ نتیجہ میں اس پر مقدمہ شروع کر دیا گیا۔ پھر اسے امرت سر جیل بھیج دیا گیا۔

امرت سر جیل پہونچے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ وہاں کھلبلی مچ گئی۔ سنا گیا کہ امرت سر کے آس پاس جنگ شروع ہو گئی ہے۔ کیوں ہوئی؟ یہ اسے پتہ نہ چل سکا۔ اس کھلبلی میں وہاں کے سارے قیدیوں اور ان کے مقدموں کو دلی بھیج دیا گیا۔ پھر کچھ دن بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کے ملک پاکستان میں بھی جنگ شروع ہو گئی ہے۔ صدر یحییٰ خاں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور انھیں قید کر دیا گیا ہے۔ ڈھاکہ کی الگ اپنی ایک حکومت بن گئی ہے اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے محسوس ہوا کہ جنگ ہو رہی ہے، بم پھٹ رہے ہیں، لوگ بھاگ رہے ہیں، مر رہے ہیں۔ اسے اپنی بی کلاس کے ساتھی قیدیوں سے پتہ چلا کہ آج ہندوستان میں اتنے مارے گئے، آج پاکستان میں اتنے مارے گئے۔ فلاں ملک یہ کر رہا ہے، فلاں ملک وہ کر رہا ہے۔ ڈھاکہ کے لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ اسے خیال آیا کہ شاید اس کے بیوی بچے بھی بھوکے مر رہے ہوں گے۔ دل میں خدشہ ہوا کہ زندہ بھی ہیں یا نہیں اس کے دل میں ایک غبار سا پیدا ہوا۔ یہ جنگیں کیوں ہوتی ہیں؟ یہ بٹوارہ کیوں ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے! لوگ قیدی کیوں بنائے جاتے ہیں؟"

وہ لیٹ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ لیکن اس کے خوابوں کے دریچے کھل گئے وہ اپنے ملک پہونچ گیا ہے، اپنے گھر: اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے پاس۔ اس کی بیوی کی بے نور آنکھیں چمکنے لگی ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو دیوانہ وار چوم رہا ہے۔ اپنی بیوی کو اس نے اس قدر کس کے اپنی بانہوں میں جکڑ رکھا ہے کہ یہ سات سال کی دوری یک دم ختم ہو جائے اور پھر وہ اپنے کھیت پر جا رہا ہے اپنے بیلوں کو ہانک رہا ہے۔

اور پھر ایک دن وہ بھی آ گیا جب وہ اپنی جنت اپنے ملک اپنی سرزمین پر پہنچ گیا۔ اپنے گاؤں پہنچ گیا گاؤں سے گھر تک کا اوبڑ کھابڑ راستہ اس نے کس بے چینی اور بے صبری سے بھاگتے بھاگتے طے کیا تھا۔ اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ ماتھے پر پسینہ کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔

سات سال میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ کچھ پڑوسیوں نے اسے بڑی مشکل سے پہچانا ـــــ اس میں تبدیلی بھی تو بہت ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے بیوی بچوں کے بارے میں کسی نے کچھ نہ بتایا۔ اس کا دل

اداس ہو گیا۔

اس نے بیوی کے میکے جانے کی سوچی لیکن اس کا گاؤں تو بہت دور تھا۔ بیوی بچوں کی چاہ اور ملنے کی امنگ نے اس کی ہمت بندھائی۔ گاؤں پہنچ کر دس کوس کا پیدل راستہ اس نے طے کیا۔ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی، اس کے دل کی خوشی اور وسوسے بڑھتے جاتے تھے۔ سات سال بعد وہ اپنے بیوی اور بچوں سے اچانک ملے گا ـــــ کتنے خوش ہوں گے وہ ـــــــــ آخر کار گھر آ گیا ـــــــ وہ پہچان گیا۔ کیسے بھول سکتا تھا اس گھر سے اختری کو ڈولی میں لے کر گیا تھا ـــــــ وہ دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا ـــ ـــ ـــ ـــ اختری ـــــ ـــ اختری ـــ ـــ اختری وے اختری ـــــ ـــــ ـــــ میں آ گیا وے ـــــــــ میں آ گیا وے ـــــــــ اس نے دیکھا اختری باورچی خانہ میں بیٹھی بچہ کو دودھ پلا رہی ہے ـــــ یہ دیکھ کر اس کی زبان گنگ ہو گئی ـــــــــ ہاتھ پیر شل ہو گئے ـــــ اے کون اے اختری؟ ـــــــ تو کون ہے وے؟؟ اِتھے کیوں آیا وے ـــــ باہر کڈھ اِس نو ـــــ

اختری میں ـــــــ میں اللہ داد وے ـــــ اللہ داد۔ میرے بچے ـــــ؟ میرے بچے کتھے ـــــــــ

نیم بے ہوشی میں اسے محسوس ہوا کہ جیسے ساری دنیا میں جنگ چھڑ گئی ہے اور سارے بم اس کے دماغ پر آ کر گر گئے ہیں ـــــ وہ چلایا۔ اے گھر میرا وے، اے بچے میرے وے، اے ملک میرا وے، ـــــ

وہ چیختا ہی چلا گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے ملک میرا وے، اے گھر میرا وے، اے بچے میرے وے، اے ووٹی میری وے، اے بچے میرے وے،

گاؤں میں ایک پاگل کا اضافہ ہو گیا تھا جو دن رات یہی چلاتا رہتا تھا۔ اے ملک میرا وے، اے گھر میرا وے، اے بچے میرے وے۔

بیاہ

"بیاہ"

آج شیلا کا بیاہ تھا۔ پچھلے پانچ سال سے جس شبھ گھڑی کا انتظار تھا آخر وہ آہی گئی تھی، یوں تو شیلا کی شادی کئی سال پہلے ہو گئی ہوتی لیکن لڑکے والوں کی مانگ اتنی لمبی تھی کہ شیلا کے پتا جی ہرنام داس کو انتظام کرتے کرتے یہ پانچ سال بیت گئے تھے۔ اسکوٹر، فریج، ٹیلی ویژن، معہ کراکری اور دیگر سامان کے علاوہ نقد چوبیس ہزار کی مانگ ان کے لئے جوئے شیر لانا تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اچھا بر ملتا کہاں ہے؟ اور جب ملا ہے تو اس کو یوں ہاتھ سے نہ نکلنے دینا چاہیئے۔

باہر سے ہنگامہ شروع ہوا، برات آگئی، برات آگئی۔ بینڈ باجے، آتش بازی۔ آواز قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔ ایک شور تھا کہ کان پڑے سنائی نہ دیتا تھا۔ شیلا کی سہیلیاں اس کو سجاتے ہوئے چھوڑ کر برات دیکھنے بھاگ گئیں۔ وہ خود سمٹ کر ایک کونے میں بیٹھ گئی، اس کا تمام عکس شیشہ میں سمو کر آنکھوں کے ذریعہ دل میں اتر رہا تھا۔ کتنی خوبصورت ہے وہ؟ فخر سے اس کی گردن ذرا اونچی ہو گئی۔ اور وہ پھر جیسے خود سے ہی شرما گئی۔ سہیلیوں کے غول نے اسے پھر

گھیر لیا تھا۔ "بس دروازے پر برات آنے ہی والی ہے۔" کسی کی آواز آئی۔

ناچ گانا، ٹھمک، بھنگڑا، بینڈ باجے ہر ایک اپنی ہی دھن میں مست۔ محسوس ہوتا تھا برات آج نچ کر پھر کبھی نہیں بجے گی۔

فوٹو گرافر دھڑا دھڑ اس قیمتی اور ناقابل فراموش لمحے کو اپنے کیمرے میں بند کر رہے تھے۔ سمدھی سمدھن ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ برات اندر داخل ہو چکی تھی۔ دولہا کو سجی سجائی اونچی اسٹیج پر چڑھایا گیا تھا جو پہلے سے ہی اس کی منتظر تھی۔

جے مالا کے مدھر گیت کے ساتھ شیلا دونوں ہاتھوں میں ور مالا لئے ہوئے چھوٹی چھوٹی خوبصورت گڑیوں کی طرح سجی ہوئی لڑکیوں کے بیچ جھومتی ہوئی چل رہی تھیں، دھیمے دھیمے لجا لجا کر آ رہی تھی، اپنے پریتم کے گلے میں ور مالا پہنانے کے لئے۔

جے مالا کا گیت آخری کڑی پوری کر رہا تھا۔

ڈالو بیٹی ڈالو ______ جے مالا ڈالو ______

"اری ڈال نا؟"

پیچھے سے کسی نے چٹکی لی۔

شیلا نے لجاتے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھائے کہ دھکا کی میں پلّو سر سے پیچھے ڈھلک گیا اور پل بھر میں ہی اٹھے ہاتھوں سے جے مالا چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ اس نے لاکھ سنبھلنے کی کوشش کی۔ لیکن فوراً ہی اشبھ اشبھ کی کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

یہ تو بڑا اشبھ ہو گیا ______

شیلا جے مالا اٹھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ جے مالا تو اتنی دیر میں دوسری اس کے ہاتھ میں آ چکی تھی لیکن اتنی دیر میں اسٹیج خالی ہو چکا تھا۔

پل بھر میں ہی ساری برات تتر بتر ہو گئی۔ سب لوگ دھیرے دھیرے موت کے پُرسے کی طرح دکھ ظاہر کرتے اور چلے جاتے۔

شیلا کے باپو نے سمدھی جی کے پیروں میں اپنی پگڑی رکھ دی۔ "میری عزت بچا لو سمدھی جی میری بیٹی تو بہت بھاگوان ہے۔ اس کو اتنی بڑی سزا مت دو۔"

لیکن سمدھی جی جیسے پتھر کے بنے ہوں۔
اسکوٹر، فریج، ٹیلی ویژن، کراکری اور نقد چالیس ہزار روپیہ سب رکھا رہ گیا۔
شیلا سجی سجائی لگن منڈپ میں بیٹھی دیوانوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھی ——— اور فوٹوگراف
آخری سین کیمرے میں بند کر رہا تھا، وہ پاگل ہو چکی تھی۔

ٹرین آئی اور چلی گئی۔ کچھ مسافر چڑھے کچھ اترے۔ کچھ ہی دیر میں پلیٹ فارم پر عجیب سا سناٹا
چھا گیا۔ وقت تو زیادہ نہیں ہوا تھا یہی کوئی رات کے دس بجے ہوں گے۔ سردیوں کا موسم تھا
سردیوں کی راتیں یوں بھی بڑی لمبی ہوتی ہیں۔ اب صبح تک وہاں سے کسی ٹرین کا گذر نہیں تھا۔
اسٹیشن ماسٹر اپنے کمرے میں آرام کرنے جا چکا تھا۔ پان والے، چھولے والے، چائے والے، پوری
والے سب اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ ایک دو مسافر بستر گوں کئے سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ تھوڑی
دیر میں وہ بھی کہیں اِدھر اُدھر یا تو سونے کی تلاش میں نکل گئے یا اپنے ملنے والوں میں۔ چوکیدار
اور اِکّا دُکّا کوئی آدمی اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔

رجّی نے اپنا پان چھالیا کا سامان سمیٹا۔ سگریٹ، بیڑی سمیٹ کر بکس میں رکھا اور پاؤں تلے
سے بوری ہٹا کر، روپیہ پیسے پھیلائے اور دن بھر کی مزدوری گننے لگا۔" دو، چار ——— چھ ———
آٹھ دس ——— پندرہ ——— بیس ——— بائیس ——— پچیس ——— پچیس روپیہ
ساٹھ اور یہ ستّر ——— پچیس روپیہ ستر پیسے ——— اور ——— کیا کر رہا رے ———؟؟
کتنا کمایا؟؟ ہرنی نے اپنے ہاتھوں اور آنکھوں کو نچاتے ہوئے پوچھا ——— تو ——— رجّی
اپنے پیسے گننے بھول گیا۔

تو بتا تو نے کیا کمایا؟ کس کا بٹوہ مارا؟ کس کی جیب کاٹی؟ کیا کیا ملا ———؟؟
سالے ——— تو ہم کو ایسے بولتا ——— ہماری جوتی نا ہی دیکھی کیا؟ ———
ہو وے کاں ہے تیرے پاؤں میں؟ ———
سالا بولتا ہے ——— چُپ ——— ؟ ———

بھیک مانگتا ہے — محنت کرتا ہے۔ چوری چکاری نہیں کرتا — اس اڈے پر آئے دس مہینہ ہو گیا کبھی کوئی بات سُنا؟ — سالے بدماس۔ اس نے ایک اور موٹی سی گالی دی — مارے غصہ کے ہرنی کا سانس پھولنے لگا۔

رجی مسکرا دیا — ناراج کاہے ہووے؟ میں تو مسکھری کر رہا تھا۔

اچھا ایک بات بتا۔" رجی نے اپنی کمائی کو تھیلی میں ٹھونستے ہوئے بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا — تو مجھ سے بیاہ کرے گی؟؟

بیاہ — ؟ تجھ سے — ؟ چل ہٹ۔ صورت دیکھی اپنی؟؟ کیا ہے تیرے پاس؟ چلا بیاہ کرنے —

تو مجھے اچھی لگے ہرنی۔

ارے اچھی ہم کس کو ناہی لگت —

رجی نے پھر کان میں سرگوشی کی —

ارے جا — تجھ جیسے کِتے دیکھے —"

ارے اِتے پیسے میں بیاہ ہووے —"

اری پانچ روپیہ کم ہوویں کیا؟؟ — پانچ دن روٹی کے کیٹیں گے آرام سے راج کرے گی بیٹھ کر —

ارے جا — جا —

سوچ لے —

ہرنی پہلے تو سوچتی رہی۔ پھر تڑک کر بولی۔ وہ نکڑ والا کنکٹا پورے بیس روپیہ دیوے ہے نہانے کو کھوسبو والا صابن دیوے ہے وہ الگ — اور وہ سامنے مندر میں سنت گورو بابا کا چیلا رہوے ہے نا؟ دل کھول کر دیوے ہے پرساد سے جھولی بھر دیوے ہے۔

" تو بھلا کس گنتی میں؟

چل اچھا ایک روپیہ اور سہی!

ہرنی سینہ پھلاتی ہوئی مسکرائی — ارے ایک بار بیاہ کرلے تو بار بار —

چل جلدی اُٹھ ـــــــ

رَجّی نے سامان کا بکس بند کر کے تالا لگایا اور دیوار سے سٹا دیا۔ کونے سے لکڑی کے دو چوکے نکالے ہتھیلیوں میں پھنسائے اور زمین پر ٹیک ٹیک کر کود کود کر چلنے لگا، کیونکہ اس کے پاؤں پولیو میں بے کار ہو چکے تھے۔

وہ دونوں پلیٹ فارم سے نکلتے ہوئے دور بہت دور درختوں کی اوٹ میں اندھیرے میں جا چکے تھے بیاہ کرنے کے لئے ـــــــ

رضیہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ریڈیو سننے میں اتنی زیادہ منہمک تھی کہ اسے گرد و پیش کا کچھ بھی احساس نہ تھا۔

اوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ ہڑبڑا کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے نجم کھڑا تھا۔ رضیہ کو اتنا زیادہ سنجیدہ دیکھ کر اسے شرارت سوجھی اور اس نے رومال کو گول مول لپیٹ کر کچھ اس انداز سے پھینکا کہ رومال رضیہ کے گداز سینہ سے ٹکراتا ہوا گود میں جا پڑا ــــــ

رومال پر نظر پڑی اور پھر نجم پر۔ کیا ہے بھئی؟ ہمارا تو ڈر کے مارے دم ہی نکل گیا۔

دم نکلے تمہارے دشمنوں کا ــــــــ ایسا نہ کہا کرو رضیہ۔ نجم نے یہ کہتے کہتے اسے اس زور سے سینہ سے لگا کر بھینچا کہ بس ــــــــ اوف: اچھا ہٹو ــــــ یہ بتاؤ جلدی کیسے آ گئے آج؟ رضیہ نے اپنی اکھڑی ہوئی سانسیں درست کرتے ہوئے کہا۔

طبیعت تو ٹھیک ہے نہ؟ کوئی بات تو نہیں؟ رضیہ نے ریڈیو بند کرتے ہوئے نجم سے کئی سوال کر ڈالے۔

ہاں ہاں بالکل ٹھیک۔ اوہ ہاں یاد آیا ــــــــ جاؤ نکال کر لاؤ موٹر سائیکل میں کیا پڑا ہے؟

اور رضیہ موٹر سائیکل کی ٹوکری میں رکھا ہوا پیکیٹ لے کر پل بھر میں آ گئی ــــــ

کھولو کھولو جلدی کھولو ــــــ پیکٹ کھولا تو جھلملاتی خوبصورت بنارسی ساڑی نے رضیہ کا استقبال کیا۔

کیسی ہے؟ رضیہ کو ساڑی دکھاتے ہوئے نجم نے پوچھا۔

بہت خوبصورت!

کیا تم سے بھی زیادہ؟ نجم نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور رضیہ شرما گئی۔

جلدی جلدی تیار ہو جاؤ آج شام باہر ہی گذاریں گے۔ کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔

کیوں؟ کیوں؟ کیوں بھئی؟ آخر وجہ کیا ہے اِس خوشی اور تفریح کی؟

بتائیں گے! بتائیں گے۔ ایک نہیں دو دو وجہیں بتائیں گے۔ جاؤ نہاؤ دھو لو تیار ہو جاؤ تو پھر بتائیں۔

اوں ہوں ــــــ پہلے وجہ بتائیں۔

ارے بابا نہا تو لو ــــــــــ

نہیں ـــــــ پہلے آپ بتائیں۔ کمال ہے۔ خوش خبریاں سناتے بھی کہیں کوئی اتنی دیر لگاتا ہے۔

سچ ـــــــ

ہوں ـــــــ

نجم نے رضیہ کو اپنے بہت قریب کر لیا۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ کمپنی کی طرف سے تین سال کے لئے میرا جدہ جانے کا بندوبست ہو گیا ہے بس اگلے ہی ماہ ـــــــ پھر ـــــــ اس نے چٹکی بجا کر بتایا ـــــــ دونوں نے خوشی کے عالم میں ایک دوسرے کو اپنی باہنوں میں بھر لیا ـــــــ

لیکن میں تو اکیلی رہ جاؤں گی۔

میں تمھیں بہت جلد بُلانے کی کوشش کروں گا۔

کیا میں تمھارے بغیر رہ سکتا ہوں؟

اچھا اب جلدی سے دوسری وجہ بتا ڈالیں۔

دوسری وجہ بہت ہی پیاری ہے ـــــــ وہ یہ کہ آج ہماری شادی کی ساتویں سالگرہ ہے۔

کیا ؟؟ ـــــــ

رضیہ حواس باختہ سی ہو گئی۔ دراصل وہ اس احساس کو مٹا دینا چاہتی تھی کہ اس کی شادی ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا وہ تو یہی چاہتی تھی کہ اسے صرف یہی محسوس ہوتا رہے کہ اس کی شادی ہوئے ابھی صرف پہلا ہی سال چل رہا ہے لیکن نجم اسے ہر سال اس بات کا احساس دلا دیتا تھا، ایک خاموش احساس۔

اُف ـــــــ اُف میرے خدا ـــــــ میرا یہ احساس مجھے جینے نہ دے گا۔ سات سال کا عرصہ بیت گیا اور ـــــــ اور ـــــــ ؟؟

نجم اس کے احساس کو جانتا تھا۔ اس نے کبھی ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا تھا، اس نے ہر وقت رضیہ کی دلجوئی کی تھی۔

نجم نے رضیہ کے نرم نرم بھیگے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رضیہ

کی آنکھوں میں لاچاری اور بے بسی کے قطرے جھلملا رہے تھے۔

نہیں رضیہ نہیں ـــــ نہیں میری رضّو ـــ میں ان قطروں کو اپنے ہونٹوں میں جذب کروں گا گرنے نہ دوں گا۔ تمہیں میری قسم رضّو۔۔۔۔۔۔۔ آخر تمہیں رونے کی کیا ضرورت ہے؟ سسکیوں کے بیچ دبی سی آواز نکلی "میں کتنی منحوس ہوں نجم" .... ان سات سالوں میں ..... میں تمہیں کچھ بھی تو نہ دے سکی۔ کچھ بھی تو نہیں۔ کیا میری گود اور تمہارے ارمان اسی طرح ـــــ ـــــ وہ سسکنے لگی۔۔۔ نجم نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ـــــ ایسا نہ کہو رضیہ ـــــ تمہیں ایسی بات سوچنا بھی نہیں چاہئے۔۔۔۔ پگلی کہیں کی ـــــ چلو اٹھو، ـــ ـــ ـــ آؤ میں تمہیں نہلاتا ہوں۔ اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر غسل خانے میں لے جانے لگا۔ ارے چھوڑئے تو ـــ چلئے ہٹئے میں خود نہالوں گی ـــــ ـــــ اور رضیہ نے جلدی سے غسل خانہ میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

نجم کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی زندگی میں سب کچھ ہونے کے باوجود بھی ایک خلا سا ہے فوراً اس کو ریٹا کی یاد آگئی جو دفتر کے چپڑاسی کی بچی تھی جب بھی آفس میں آجاتی اسے شدت سے احساس ہونے لگتا "کاش! اس کے گھر میں بھی کوئی پھول کھلا ہوتا۔ اس کے آنگن میں بھی کسی کلی کے چٹکنے کی صدا آتی۔ اور پھر سفید رنگ کی چکنی فراک، سفید جرابیں اور لال سینڈل پہنے بھورے بھورے بال اور شربتی آنکھوں والی ریٹا کو وہ اپنے پاس میز پر بٹھا لیتا اور بڑے پیار سے اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہتا۔ دل میں ایک تسکین کا سا احساس لئے جب وہ شام کو گھر واپس آتا تو سب کچھ بھول جاتا ـــ کیونکہ وہ اپنی رضّو سے بے انتہا پیار کرتا تھا۔ اس کی کسی بھی کمی کا احساس دلا کر وہ اسے دکھی کرنا نہ چاہتا تھا۔

ارے آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے ـــــ؟

نجم کے تصورات کا سلسلہ بکھر گیا۔ اور یوں پھر وہ زندگی کی گہما گہمی میں کھو گئے۔

نجم کے جدہ جانے میں چند دن باقی تھے۔ ہر روز کی طرح اس دن بھی وہ آفس جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ رضیہ اس کے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ نجم غسل خانہ میں نہا رہا تھا اور حسبِ

عادت آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ اچانک اسے عجیب سی آواز کا احساس ہوا۔ نجم نے فوراً دروازہ کھولا، اور باہر نکل آیا ـــــــ برابر میں ہی باورچی خانہ کی نالی کے پاس رضیہ بیٹھی ہوئی ابکائیاں لے رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو اس کی تکلیف کا احساس دلا رہے تھے،

کیا ہوا رضیہ؟ کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم ٹھیک تو ہو نہ؟ ڈاکٹر بلاؤں؟ وہ رضیہ کو پکڑ کر اٹھانے لگا۔

رضیہ مسکرائی ـــــــ شرم سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا ـــــ کسی انجانے فخر کے احساس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

نجم نے بڑھ کر رضیہ کو دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

کیا تمہاری مسکراہٹ نے میری تمناؤں کا بیج بو دیا ہے رضیہ؟"

ایک لطیف سی مسکراہٹ کے ساتھ شرمائی ہوئی نظروں نے اسے یقین دلایا۔

"ہاں نجم شاید ایسا ہی ہے" تمہاری تمناؤں کا بیج بو دیا گیا ہے اور اب اس میں کونپل پھوٹنے لگی ہیں" نجم نے اپنے بھیگے بدن کے ساتھ رضیہ کو چپٹا لیا۔ گود میں بھر لیا اور خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے وہ سارے آنگن میں اسے اٹھائے اٹھائے پھرا۔

اب میں نہیں جاؤں گا رضیہ ـــــــ اب میں جدہ نہیں جاؤں گا ـــــــ

"کیوں نہیں جائیں گے؟ غلط بات۔ آپ ایسا سوچیں گے بھی نہیں ـــــ اور یوں نہ چاہتے ہوئے بھی نجم اس سے دور بہت دور رضیہ کو اپنے گھر اور سسرال والوں کے سپرد کر کے چلا گیا۔ اب صرف خطوط ہی دونوں کا سہارا تھے۔ ایسی حالت میں نہ وہ اسے لے جا سکتا تھا اور نہ اس کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔

نجم نے بیتابی سے رضیہ کا خط پڑھا ـــــ اور یہ چند لائنیں اس نے بار بار پڑھیں " نجم ہماری شادی کی آٹھویں سال گرہ آ رہی ہے ـــ اور یہ سالگرہ ہم بڑی دھوم دھام سے منائیں گے۔ لیکن اس بار تحفہ آپ نہیں میں دوں گی ـــــــ سمجھ گئے نہ؟ ـــــ شریر کہیں کے ـــــــ

آپریشن روم کے باہر سب بے چینی سے چکر کاٹ رہے تھے۔ آپریشن ـــــــ آپریشن ـــــ رجسٹر پر دستخط کرنے والے رضیہ کے بھائی کے ہاتھ کانپ گئے۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپریشن

کی نوبت آئے گی۔ خیر۔ آپریشن کامیاب ہوا۔۔ اسنے ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا۔ چاروں طرف سے مبارکباد کی آوازیں آنے لگیں۔ رضیہ کو وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا ـــــ لیکن چند گھنٹے بھی نہ گذرے تھے کہ حالت بگڑنے لگی۔ فوراً بھگدڑ مچ گئی ـــــ دوسرا آپریشن ـــــ تو عمل میں آیا ـــــ ہر ڈاکٹر ہر نرس۔ چودہ بوتلیں خون کی چڑھ چکی تھیں اور ساتھ ساتھ وہ تمام خون جسم کے ہر عضو سے باہر نکل رہا تھا یہاں تک کہ آخیر میں آنکھوں تک سے خون آنے لگا۔ اور یوں اس نے حسرت بھری نگاہوں کو ہمیشہ کے لیے موند لیا۔

ادھر نجم خوشیوں اور ارمانوں کے ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔ اسے ہر وقت ٹیلی فون پر کسی خوش خبری کا انتظار تھا۔

لیکن یہ کیا ہو گیا ـــــــــ یہ ٹیلی فون پر وہ کیا خبر سن رہا ہے ـــــ جیسے اس کی سماعت سے ساری آواز ٹکرا کر واپس جا رہی ہو ـــــ یہ کیا ہو گیا ـــــ ـــــ ـــــ یکایک وہ چیخا۔ میں آ رہا ہوں رضو ـــــ میں آ رہا ہوں ـــــ ـــــ میرا انتظار کرنا ـــــ ـــــ ـــــ فون بند ہو گیا ـــــ کیا کرے کرجائے ـــــ بچہ کے لیے خوبصورت خوبصورت کپڑے؟ رضیہ کے لیے پرفیوم؟ ساڑیاں؟ اس سب سامان کا کیا کرے؟؟۔

تمام گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ رضیہ کا جسم سفید لباس پہن کر آخری سفر کے لیے تیار تھا۔ اسے صرف نجم کے کاندھے کا انتظار تھا اور نجم اپنے ہوش میں کب تھا؟ وہ تو بچوں کی طرح پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ وہ تو رضیہ کو دیوانہ وار پکار رہا تھا کہ یکایک کسی نے معصوم ننھی سی جان کو لاکر اس کی گود میں رکھ دیا ـــــ ـــــ اسے سکتہ سا ہو گیا ـــــ مسلسل خاموشی ـــــ

اسے رضیہ کا آخری خط یاد آیا جس کی چند لائنیں اس نے بار بار پڑھیں تھیں: "ہم شادی کی سالگرہ بہت دھوم دھام سے منائیں گے اور اس بار تحفہ میں دوں گی۔"

نجم نے اس ننھی سی جان پر نظر ڈالی۔ دل میں ایک عزم سا پیدا ہوا اور یہ سوچ کر کہ وہ اس تحفہ کی خاطر ضرور جیئے گا۔ زندگی سے جوجھنے لگا۔

عکس

عکس

اُف میرے خدا۔ یہ میں نے کیا دیکھ لیا۔ میرا وجود پارہ پارہ ہو کر لرزنے لگا ہے۔ دل کی گھٹن بڑھتی ہی جا رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاش میں نے یہ سب کچھ نہ دیکھا ہوتا۔ بچپن سے لے کر جوانی کے آخری لمحوں تک کی یادیں میرے ذہن کو جھنجھوڑنے لگیں۔ اس وقت میں کوئی چھ برس کی تھی۔ ایک صبح سوتے میں میری ران پر اتنی زور سے چانٹا پڑا کہ میں بلبلا کر اٹھ بیٹھی۔ چاروں طرف دیکھا کوئی نہ تھا، ابا جان کیاری کے پاس بیٹھے تازہ گلاب دیکھ رہے تھے اور حسب عادت قرآن پاک کی کوئی سورت باآواز بلند پڑھ رہے تھے۔ پوچھنے کی ہمت نہیں کہ کیا ہوا؟ خود ہی خیال کیا کہ غرارہ پہن کر سو رہی تھی شاید سوتے میں اوپر اُٹھ گیا ہو گا۔ یہی ابا جان کے غصہ کی وجہ ہو سکتی ہے۔ کتنا غصہ تھا ابا جان کو۔ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ امی جان کو ذرا ذرا سی باتوں پر کس بری طرح لتاڑتے تھے اور دوسرے ہی لمحہ ان کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتے تھے۔ جب ابا جان اسکول سے پڑھا کر آتے تھے، تو کیا مجال گھر میں ذرا سی بھی کسی کی آواز نکل جائے۔ بقول امی کے "تمہارے باپ تھکے ہوئے آئے ہیں۔" آرام کی ضرورت ہے۔ یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ بچے بھی اسکول سے تھکے ہوئے آئے ہیں، کھیلنے اور چہکنے کی ضرورت ہے۔

بس رات کو ابا جان کسی نہ کسی نشست میں ضرور جاتے۔ یہ نام میں بچپن سے سنتی چلی آئی ہوں، تب ہم سب بہن بھائی مل کر خوب دھما چوکڑی مچایا کرتے تھے۔

بچپن کی وہی شریر عادتیں۔ اوروں کے ساتھ ساتھ ابا جان کی چیزیں بھی چپکے چپکے چھیڑنا شروع کیں اور نہ معلوم ابا کو کیسے پتہ چل جاتا تھا۔ صرف غصہ سے آواز لگتی تو خون خشک ہونے لگتا تھا۔ ڈانٹ پڑتی تو ڈر کے مارے پیشاب نکل جاتا۔ کچھ پوچھا جاتا تو آواز ہی نہ نکلتی۔

جوں جوں بچپن جانے لگا، توں توں سمجھ آنے لگی۔ ابا جان کی عادتیں کتنی عجیب ہیں، کیا تو سلے

کام خود کرلیں گے، ریڈیو خود ٹھیک کرلیں گے، بجلی خود ٹھیک کرلیں گے، پریس خود ٹھیک کرلیں گے۔
کتنی خوبصورت تصویریں بناتے تھے۔ کتنا خوبصورت ابری کاغذ بنایا کرتے تھے کیا کیا کام کرتے تھے
کہ بس .... اور دوسری طرف گھڑے سے پانی لے کر بھی خود نہیں پی سکتے۔ ہم بچوں
سے کبھی کھیلتے بھی نہیں۔ ہنسی مذاق بھی نہیں۔ اتنی سخت مزاجی کہ ہر بات کا آرڈر۔ کسی بات میں نہ
سننے کی عادت تو جیسے تھی ہی نہیں۔

پانچ منٹ بھی کبھی انھیں اپنے اسکول پہنچنے میں دیر نہیں ہوتی تھی اور اگر پانچ منٹ کبھی ہمیں
اسکول جانے میں دیر ہو جائے تو سارا محلہ سر پر اٹھا لیں۔ سالن میں نمک مرچ تیز ہو جائے تو سالن کا
پیالہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آنگن میں بکھر جائے۔ ہر وقت ہر کام قاعدہ کا نپا تلا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات
ہوئی۔ ہر وقت رعب ہی رعب۔ پاس بلاتے۔ آرڈر ملتا۔ بیٹھو۔ ہم بیٹھ جاتے۔ کہتے کہو بیس بار۔ جھوٹ
بولنا گناہ ہے۔ زبان میں گندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر کہتے کہو بیس بار۔ دل کی بات نہیں مانتے۔ دل
غلط کام کرواتا ہے۔ کس قدر اکتا دینے والا بچپن تھا وہ۔ خدا کی پناہ ـــــ آہستہ آہستہ پتہ
چلا کہ ابا جان شاعر ہیں۔ دل چاہا چوری چھپے پڑھیں ابا جان کیا لکھتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ اتنے
سخت مزاج ابا جان شاعر کیسے ہو سکتے ہیں! شاعری بھی ایسی کہ آہ ـــــ دل تڑپ اٹھے۔
کیا ابا جان اندر سے اتنے نرم ہیں؟؟ کیا ابا جان کے دل میں بھی اتنے نرم گرم احساسات ہیں۔ یقین
نہیں ہوتا کہ باہر سے اتنے سخت دکھائی دینے والے ہمارے ابا جان اتنے حساس ہوں گے۔ اور اتنا
جذباتی کلام کہتے ہوں گے۔ تو پھر یہ غصہ؟؟ شاید خاندانی چلن ـــــ

اب پوری طرح ہمارا شعور جاگ اٹھا تھا اور ابا جان کی پوری شخصیت ہمارے سامنے واضح ہو چکی
تھی۔ ابا ہمیں آہستہ آہستہ بہت اچھے لگنے لگے۔ ہر بات میں مردانگی، حسن و وقار، نفاست پسندی،
علمیت، اولاد کی پرورش کا ڈھنگ، سبھی کچھ ابا جان میں بڑے نرالے انداز میں موجود تھا۔ آپا کا
سارا کام میں خود کرتی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی۔ ابا خوش ہوتے۔ کہتے۔ "واہ بیٹا شاباش۔
بہت اچھا ہوتا چمکایا ہے میرا۔

آہستہ آہستہ ابا کا مزاج بدلتا جا رہا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح غصہ میں نہیں ہوتے تھے۔ اب
ابا جان کو کسی بات میں ہماری دخل اندازی بری نہیں لگتی تھی۔ "ابا جان یہ کپڑے پہنیے۔ یہ والا جوتا۔

اور ہاں یہ والا سویٹر ـــــ اور یہ کالا سوٹ اور فلاں خوشبو لگا کر نشست میں جائیے گا۔ آج ـــــ
لائیے ابا جان۔ میں کاٹ دوں آپ کے ناخن۔ بالکل گول کاٹوں گی۔ ذرا بھی کہیں نوک نہیں بچے گی۔
ابا مسکرا کر قینچی تھما دیتے۔

ایک دن ابا کے دوست جنھیں ہم چاچا کہتے تھے، موجود تھے۔ انھوں نے فرمائش کی کہ کوئی تازہ غزل ہو جائے۔ ابا جان شروع ہوئے۔ آخر میں جب مقطع کہہ رہے تھے کہ آخری لائن بے ساختہ میرے منہ سے نکل گئی۔ بڑے تعجب سے مجھے دیکھا اور جب چچا چلے گئے تو پاس بلایا۔ مجھ سے بولے ذرا پڑھنا اس وقت کیا پڑھا تھا"؟ مارے ڈر کے کھڑے کھڑے پاؤں کپکپانے لگے۔ ہمت جواب دیگئی۔ سمجھا کر بولے :- یہ تمھاری پڑھائی کے دن ہیں، فضول کاموں کی طرف توجہ نہ دیا کرو۔

وقت گذرتا گیا۔ نہ جانے کس جذبہ کے تحت میں نے افسانے لکھنے شروع کیے۔ چپ چاپ طبع آزمائی کرتے کرتے ایک دن وہ آیا کہ چھوٹے چھوٹے پرچوں میں وہ افسانے چھپنے لگے۔ شوق بڑھتا گیا ـــــ لیکن ابھی تک اتنی ہمت نہ تھی کہ ابا جان کو دکھا سکوں کہ کیسا لکھا ہے ؟ ڈرتا کہیں برسوں کا گیا طوفان پھر واپس نہ آجائے۔ اور پھر ایک دن امی نے تذکرہ کر ہی دیا ـــــ قیامت آگئی ـــــ سارے پرچے طلب کیے۔ ڈرتے ڈرتے ہم نے وہ تمام پرچے لا کر دے دیئے، جن میں ہمارے افسانے چھپے تھے۔

کئی دن بعد بلایا ـــــ افسانہ لکھنے کی تمام باریکیاں سمجھائیں اور کہا کہ آئندہ کسی پرچہ میں بھیجنے سے پہلے کسی کو دکھا دیا کرو۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ کیا بات ہوئی۔

جیسے جیسے ہمارے قدم جوانی کی دہلیز پر بڑھتے گئے وہی ابا ہمارے آئیڈیل بنتے گئے۔ ان کی ہر بات میں آن اور ہر ادا میں شان اور وقار نظر آنے لگا۔ مجھے ابا جان سے اس قدر محبت ہوئی کہ جس کو ظاہر کرنا میرے بس میں نہیں۔ تمام عزیزوں کی مرضی کے خلاف ابا جان نے مجھے سب اولادوں سے زیادہ پڑھایا۔ ان کی نظرِ عنایت سب سے زیادہ مجھ پر رہتی تھی۔ ابا نے ایک دن کہا تھا مجھے صرف تم میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ ابا نے ایک خط میں مجھے 'غزل' لکھا تھا ابا مجھ سے ہر طرح کی باتیں بے تکان کیا کرتے تھے۔ امی ٹوکا کرتیں تو کہتے تھے۔ یہ بیٹی نہیں بیٹا ہے۔ زمانہ کی اونچ نیچ اور اپنا تجربہ بتاتا رہتا ہوں، تم ٹوکا مت کرو۔

کاش میں بھی ابا کو بتا سکتی کہ میں آپ کو کتنا چاہتی ہوں آپ مجھے اپنا آئیڈیل اور میرے تصورات کا مکمل شاہ کار نظر آتے ہیں۔ آپ ہر فن میں استاد ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے میں آپ کی تمام خوبیوں کی تعریف کروں۔

عمر کے تیس سال کیسے پَر لگا کر اڑ گئے۔ میں نے ایم اے کر لیا تھا۔ سب کی شادیاں ہو چکی تھیں وقت اور ماحول بدلتا جا رہا تھا۔ ابا کا خاندان طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اور امی خوش و خرم و مطمئن نظر آتی تھیں۔ ابا کا غصہ اولاد و نواسے نواسیوں نے اور پوتے پوتیوں نے ختم کر دیا تھا۔ سب ابا کے کندھوں پر چڑھے رہتے تھے۔ میری شادی کے بعد ابا بہت غمگین رہنے لگے تھے۔ ان کی والہانہ محبت کا ثبوت صرف وہ خطوط ہیں جو وہ مجھے لکھتے رہے ہیں۔ اب ابا کمزور ہو چلے تھے۔ چوڑا چکلا سینہ نرم پڑنے لگا تھا۔ خود کہا کرتے تھے۔ اب ہم چراغ سحری ہیں اور ایک دن ابا کا یہ کہنا درست ثابت ہوا۔ ایک ہی ہفتہ پہلے کی بات ہے! ابا کی اچانک طبیعت خراب ہوئی۔ پروسٹریٹ کا آپریشن ہونے والا تھا۔ سارا گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ ابا مسکرا مسکرا کر سب سے باتیں کر رہے تھے۔ گھر میں تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ جس کو جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گیا۔ صرف میں ہی تو رہ گئی تھی۔ ابا بھی سو چکے تھے۔ ہر بستر پر دو دو تین تین پڑے تھے۔ امی کو بھی بچوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ صرف ابا کا بستر خالی تھا، میں چپکے سے ابا کے لحاف میں گھس گئی اور ان کی پیٹھ سے چپک کر ایسی سوئی کہ ہوش ہی نہ رہا۔ سویرے ابا کلبلائے۔ ارے بھئی یہ میرے پاس کون لیٹ گیا۔ "میں ہوں ابا جی۔" ابا نے چھوٹے سے بچہ کی طرح مجھے سینہ سے چپٹا لیا میری آنکھیں محبت کے اس لمس سے بھر آئی تھیں ــــــ آپریشن ہوا ــــــ تیسرے دن ابا ہم کو چھوڑ کر چل دیے، جس کے تصور سے ہی کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا، دل بیٹھنے لگتا تھا، پاگل ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ ہو چکا تھا۔

آہ ابا ــــــ اب میں کس کے لیے لکھوں گی؟ کیا لکھوں گی؟ کون خوش ہوگا؟۔

میرے اس ادبی ذوق کے جنم داتا مجھ کو تنہا ــــــ کئی دن گذر گئے۔ ہر پل ابا کی باتیں ہوتی رہتیں۔ ابا سب کو خواب میں نظر آتے۔ کسی کو کسی طرح کسی کو کسی طرح ــــــ میرے دل کی خلش دل ہی میں رہی۔ ابا مجھے نظر کیوں نہیں آتے؟ کیا مجھ سے ناراض ہیں؟ زیادہ سے زیادہ تلاوت کرتی، درود و دعائیں پڑھتی۔ ثواب پہنچاتی۔ تصور کر کے لیٹتی۔ ابا نظر نہیں آتے ــــ کاش میں بھی ابا کو دیکھتی ــــ میں تو ابا کے سب سے زیادہ قریب تھی، بیماری میں بھی، زندگی میں بھی، خوشی میں بھی،

غم میں بھی۔ ابا سب سے زیادہ مجھے چاہتے تھے۔ کیسا خوش ہوتے جب ابا کے پاؤں دھلاتی، سر دھلاتی، پھر کیا وجہ ہے ؟ وقت گذرتا گیا۔ میری بے چینی بڑھتی گئی۔ ابا کاش ایک بار مجھے بھی نظر آئیے۔

کیسے ہیں ؟؟ کہاں ہیں ؟ آپ کی ایک ایک یاد میرے ذہن کے ٹکڑے ٹکڑے کئے دے رہی ہے .... ابا نظر آئے ـــــــ ـــــــ اُف میرے خدا ـــــــ یہ میں نے کیا دیکھ لیا ـــــــ میرا وجود بکھر رہا ہے۔ یہ سب کیا ہے ؟ ابا کی پاکیزگی اور میری والہانہ محبت کا یہ انداز ـــــــ ؟؟ لیکن خواب پر کس کا بس چلا ہے ـــــــ ؟؟ ابا اور میں ـــ اتنے قریب ـــــ ؟؟ کاش میں نے ابا کو خواب میں دیکھنے کی خواہش نہ کی ہوتی ـــــ کیا میری محبت کی انتہا صرف یہی تھی ؟؟؟

روشن

"روشنی"

خودکشی۔ ہاں خودکشی۔ سینتا کو جیسے اپنے تمام مسئلوں کا حل مل گیا۔ زندگی کی تمام تر پریشانیوں سے نجات پانا اتنا آسان بھی ہو سکتا ہے یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا اور شاید وہ سوچ بھی نہیں پاتی اگر یہ تین بہنوں کی خودکشی کا معاملہ اس کے سامنے نہ آتا۔

یہ بات نہیں کہ خودکشی کا یہ کوئی پہلا واقعہ تھا۔ خودکشی تو کسی نہ کسی انداز سے ہر زمانہ میں ہوتی رہی

رہی ہیں اس کی نوعیت چاہے کچھ بھی رہی ہو۔ اس طرف تو اس کی توجہ صرف اس لیے مبذول ہوئی کہ ان تینوں بہنوں کی خودکشی کے تمام مسائل بالکل ایسے ہی تھے جیسے خود اس کے تھے۔

بچپن کے چھ سال کی اکا دکا باتوں کے علاوہ اسے کچھ بھی یاد نہیں البتہ باقی بیس برسوں کی کہانی اسے جوں کی توں یاد تھی۔ زندگی کا کوئی اچھا لمحہ تو اسے کبھی یاد ہی نہ آتا سوائے اس کے کہ ہمیشہ اس کے ماں باپ نے اس کے چھوٹے بھائیوں میں زیادہ دلچسپی رکھی۔ کھانے کا مسئلہ ہو یا کھیلنے کا۔ پڑھنے کا مسئلہ ہو یا کپڑے کا۔ اس کے بھائیوں کو چھوٹا ہوتے ہوئے بھی اس سے فضیلت رہی، وہ تو شروع سے ہی گورنمنٹ اسکول میں پڑھتی تھی۔ اور دونوں بھائی پبلک اسکولوں میں۔ کتنا روپیہ خرچ ہوتا تھا ان پر۔ راجو دسویں میں آگیا تھا اور سونو (سنیل) پانچویں میں اور منی کو تو اس سال اسکول میں ڈالا تھا۔

اسے تو ہر بات میں کمتر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ تو سہنے اور برداشت کرنے کی اس نے اپنے اندر ہمت پیدا کر لی تھی۔ کہ شاید یہی اس کا مقدر ہے۔ یا پھر شاید لڑکیوں کا مقدر ہی یہی ہوتا ہے۔ انھیں تو صرف گھر سنبھالنا ہوتا ہے۔ ماں کے یہاں بھی دوسرے کے یہاں بھی۔ لیکن لڑکا تو مرد بنتا ہے۔ سارے خاندان کا پالن پوشن کرتا ہے، ماں باپ کا بھی اپنے آنے والے خاندان کا بھی۔ لیکن یہاں تو مسئلہ صرف اس کی اپنی ذات کا تھا۔ جیسا کہ وہ سنتی چلی آئی تھی کہ وہ بہت معمولی شکل و صورت کی ہے۔ ماں باپ میں اس کو لے کر اکثر جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ ماں باپو کو دوشی ٹھہراتیں اور باپو ماں کو۔ کئی بار اس کو سجا سنوار کر لڑکے اور لڑکے والوں کو دکھایا جا چکا تھا۔ اسے لگتا جیسے وہ کوئی دوکان میں رکھی ایک وشے ہے اس کی قیمت لگے گی اور وہ بک جائے گی، یا پھر یوں ہی پڑے پڑے سڑ جائے گی۔

کبھی اس کو ماں باپ پر غصہ آتا کہ ان پر ڈھیر سارا روپیہ کیوں نہیں؟ کبھی اس کو اپنے بھائیوں پر غصہ آتا کہ اگر وہ دونوں نہ ہوتے تو ان پر خرچ ہونے والا سارا روپیہ بچ جاتا اور اس کی شادی ہو جاتی۔ لیکن پھر بھائی بہن کے بندھن اور ماں باپ کے خونی رشتوں کی محبت میں وہ سب کچھ بھول جاتی۔

اسے اچھی طرح یاد ہے جب انیل سے اس کا رشتہ چلا تھا۔ چلا بھی کیا تھا وہ تو بس ماں باپ کی باتیں سنتی رہتی تھی۔ بڑا شریف ہے، بڑا سندر ہے، بڑی اچھی نوکری ہے، افسر ہے افسر۔

تب وہ انیس برس کی تھی۔ اور بی اے میں پڑھ رہی تھی جب انیل اپنے ماں باپ کے ساتھ اسے دیکھنے آیا تھا۔ تو وہ کتنا شرمائی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے انیل کی نظریں اس کے انگ انگ کو چیر رہی ہیں۔ ایسا سوچ سوچ کر وہ خود ہی شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ کوئی بات بھی اس کے منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔ بس جو کچھ اس سے پوچھا گیا اس کا جواب بھی وہ بڑی مشکل سے دے پائی تھی۔ اس دن باپو کے کئی سو روپیہ ان کی خاطر مدارات میں خرچ ہو گئے تھے۔ دو دن پہلے سے ہی گھر میں تیاری شروع ہو گئی تھی۔ ماں نے خاص طور سے اس کے لیے گلابی کپڑے سلوائے تھے۔ اس کا بناؤ سنگار بھی کیا گیا تھا۔ انیل کو دیکھتے ہی وہ دل ہی دل میں اس کی مالا جپنے لگی تھی۔ لیکن کچھ دنوں بعد اس کا دل ٹوٹ گیا جب اسے پتہ چلا کہ اس کا قد چھوٹا ہے۔ کئی دن بعد اس نے باپو کو ماں سے یہ کہتے سنا کہ "اچھی قد کا تو بہانہ ہے ان کی مانگ بڑی لمبی ہے بات نہیں بن سکیگی" ماں نے کہا تھا تم نے اتنا اونچا گھرانہ اور ایسا سندر لڑکا دیکھا ہی کیوں تھا۔؟ معمولی لڑکا اور معمولی لوگ دیکھو تاکہ سنیتا کھپ جائے۔

وقت گذرتا گیا اور حالات بدلتے گئے۔ اب تو خود کو دکھاتے دکھاتے وہ شرمانا بھی بھول گئی تھی۔

جب ہریش کا رشتہ چلا تھا تب ایک بار پھر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوئی تھیں۔ وہ پڑھا لکھا تھا، میڈیکل آفیسر تھا، اس رشتہ کو اخبار کے کالم سے دیکھکر اس کے چاچا جی نے باپو کو بتایا تھا۔ فوٹو دیکھ کر تو انہوں نے سنیتا کو پسند کر لیا تھا، لیکن جب حقیقت میں وہ لوگ اس کو دیکھنے آنے والے تھے۔ تب ماں نے اس کو بیوٹی سیلون بھیج کر تیار کروایا تھا۔ تیار ہونے کے بعد جب سنیتا نے خود کو دیکھا تو اسے لگا کہ وہ وہ نہیں۔ اور وہ۔ وہ نہیں کے چکر میں پڑکر خود کو بالکل ہی بھول گئی۔ اور وہ اتنی زیادہ گھبرائی کر ہریش سے بات بھی نہ کر سکی۔ اس کی باتوں کا صحیح جواب بھی نہیں دے سکی۔ کتنی شرمندہ ہوئی تھی وہ جب اس سے گھبراہٹ میں ہریش کے کپڑوں پر چائے گر گئی تھی۔ اور شاید اسی لیے ہریش نے اس کو اپنے قابل نہیں سمجھا۔

گھر میں آہستہ آہستہ تناؤ پیدا ہونے لگا۔ جھگڑے بڑھنے لگے۔ ماں باپ کی نظروں میں اس کے لئے حقارت نظر آنے لگی۔ بھائیوں نے بھی اس کی دنیا میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ دنوں

میں فضا پھر بدلی۔اس بار نریندر کا رشتہ تھا۔وہ کسی کپڑے کی دوکان پر سیلزمین تھا۔انھوں نے سنیتا کو پسند کر لیا تھا۔آخر میں نریندر سے یہاں آکر بات رک گئی کہ انھیں نوکری کرتی ہوئی لڑکی چاہیے۔باپو نے انھیں بہت سمجھایا کہ میری لڑکی بی اے بی ایڈ ہے نوکری کے لیے درخواست دے رکھی ہے بس لگ ہی جائے گی اس میں نقصان ہی کیا ہے نوکری کرے گی تو اس کے لیے اچھا ہی ہوگا۔آپ رشتہ طے کر لیجیے۔

لیکن سنیتا کو یہ اچھا نہ لگا۔اسے محسوس ہوا کہ انھیں میری نہیں بلکہ ہر ماہ روپیہ لانے والی ایک عورت کی ضرورت ہے جسے وہ کئی استعمال میں لا سکتے ہیں۔بچے بھی پیدا کرے گی۔گھر بھی سنبھالے گی روپیہ بھی لائے گی پتی کی سیوا بھی کرے گی۔بعد میں چاہے حالات کے تحت اسے نوکری کرنا پڑتی لیکن نوکری والی لڑکی تلاش کرنا اسے پسند نہ آیا۔اور اس نے ساری ہمت بٹور کر ماں کو اس رشتہ کے لیے انکار کر دیا۔

ماں بپھر گئی۔باپو نے سمجھانا شروع کیا۔ساری عمر کیا اسی گھر میں بیٹھے رہنا ہے؟ پھر ایسا لڑکا ملنے والا نہیں۔لیکن سنیتا اپنی بات پر اڑی رہی۔

ماں اور باپو میں پھر اس کو لے کر زبردست جھگڑا ہوا۔سونو اور منی سہم گئے۔راجو تو بڑا ہو گیا تھا اس کی تیکھی نظریں کسی نشتر سے کم نہ ہوتی تھیں۔اسے اپنا وجود گنہ گار لگنے لگا۔ان حالات کی اصل قصوروار وہ خود ہی تو تھی۔گھر کے حالات اس طرح بگاڑنے کا بھلا اس کو کیا حق پہونچتا ہے؟ لیکن وہ کیا کرے؟ اسی دوران تین بہنوں کے خودکشی کے ہنگامے نے اس کے تمام مسائل حل کر دے وہ خود میں کافی مطمئن ہو گئی۔وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔

کتنا عجیب حادثہ تھا۔وہ منی کی فیس جمع کرانے اسکول جا رہی تھی کہ ایک عورت کار کی زد میں آکر کافی زخمی ہو گئی تھی اور کار والا فوچکر ہو گیا تھا۔عورت کی ناک سے کافی خون بہہ چکا تھا کوئی بھی اس کے پاس رکنے کی تکلیف گوارہ نہیں کر رہا تھا۔خون زیادہ بہنے سے اس کی موت بھی ہو سکتی تھی۔عورت نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔سنیتا اس کو آٹو رکشا میں ڈال کر فوراً ایک قریب کے اسپتال میں پہونچ گئی۔فوراً امداد ملنے پر بھی اس عورت کو کئی گھنٹوں میں ہوش آیا۔

اس رات سنیتا سو نہیں سکی شاید یہ دن اس کی زندگی کا آخری دن تھا۔اسے بار بار خون میں لتھڑی عورت کا خیال آجاتا۔اس کے روتے ہوئے چھوٹے سے بچے کا جو بیبی کی گود سے نکل کر ماں کے پاس جانے

سے لیے تڑپ رہا تھا۔اس کے پتی کا پریشان کن چہرہ، ڈاکٹر نے بار بار کہا تھا اگر اسپتال پہونچنے میں دیر ہوجاتی تو ان کی جان خطرے میں تھی۔ان کو برین ہیمبرج ہوسکتا تھا۔سینتا کو لگا اس نے ایک بچہ کو بے ماں کا ہونے سے بچالیا ہے۔ایک پتی کا گھر اجڑنے سے بچالیا ہے۔اس نے اس عورت کو نئی زندگی دی تھی۔ اس کا پتی کس طرح سینتا کا شکریہ بار بار ادا کر رہا تھا۔ اور خود وہ عورت ہوش آنے پر خاموش نظروں سے کسی دیوی کی طرح اس کو نہار رہی تھی۔سینتا کو اپنا غم بہت ہلکا لگا۔اس نے سوچا کیا وہ صرف ایک ایسے پتی کے لیے زندہ تھی جسے اس نے کبھی دیکھا تک نہیں۔زندگی میں اور بھی بہت کچھ موجود ہے۔ اس عورت کی نئی زندگی نے اسے جینے کا پیغام دیا تھا۔اس نے فیصلہ کیا وہ جئے گی ضرور جئے گی ان کیلئے جن کو اس کی ضرورت ہے۔ اس ڈاکٹر کی طرح جو ہزاروں موتوں سے دن رات جھوجھتا ہے، اس نرس کی طرح جس نے اپنی راتیں دوسروں کے لیۓ وقف کر رکھی ہیں۔ بالکل مدر ٹریسا کی طرح ——— رات گذر چکی تھی۔اندھیرا چھٹ گیا تھا۔ پھر صبح نمودار ہوئی اور چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔

"سیلاب"

کامریڈ رگھبیر سنگھ ——————
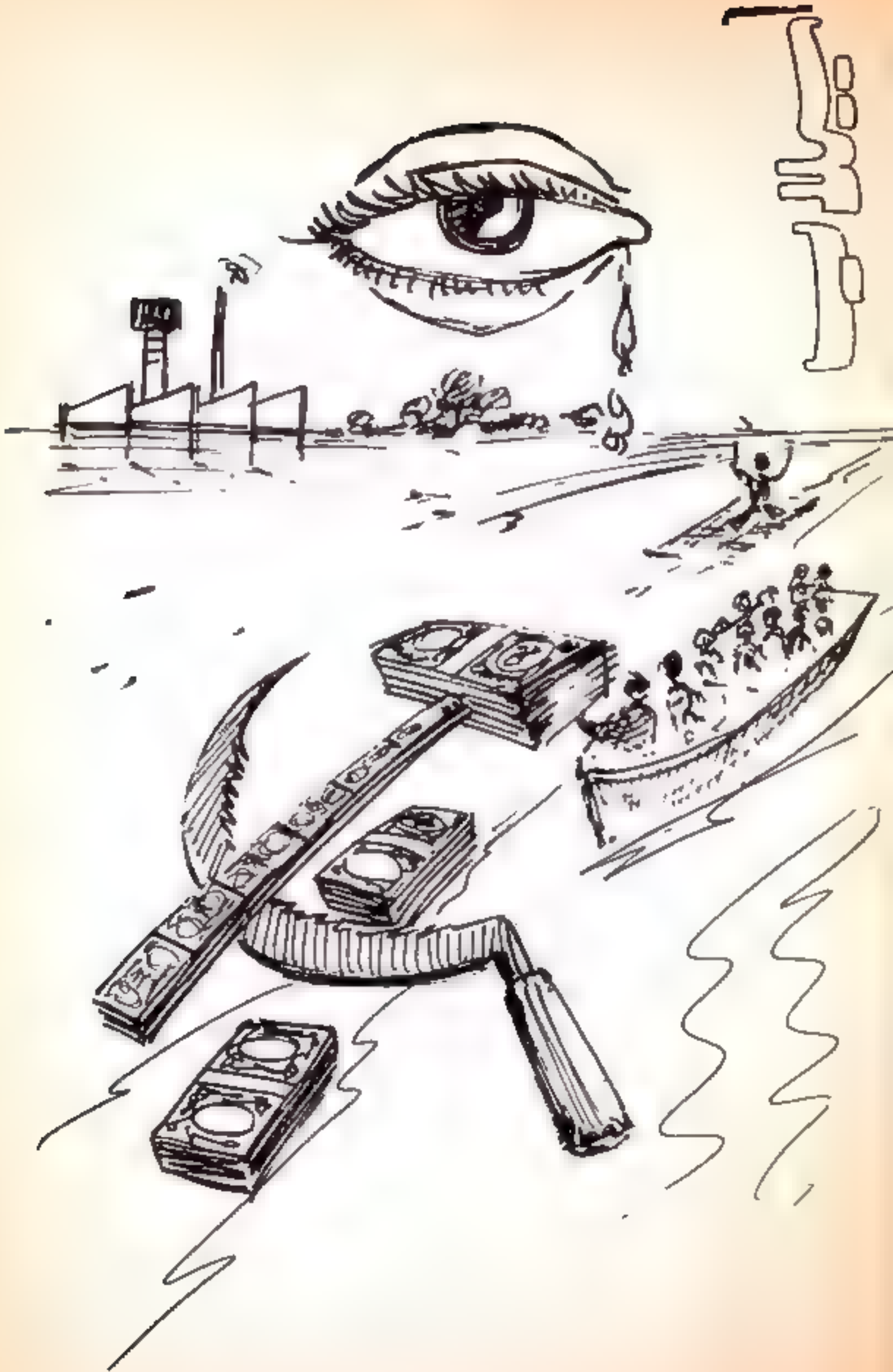
زندہ باد

ٹوڈی بچہ ———

ہائے ہائے

رام کشن سنگھ ـــــــ

ہائے ہائے

ہماری مانگیں ـــــــ

پوری کرو

جو ہم سے ٹکرائے گا ـــــــ

چور چور ہو جائے گا

مزدور ایکتا ـــــــ

زندہ باد

دنیا کے مزدور ـــــــ

ایک ہیں ایک ہیں

کان پور ربر مل کے یہ مزدور تین ماہ سے یہی نعرے لگا رہے تھے۔ مینجمنٹ سے سمجھوتہ کی امیدیں کم ہو چکی تھیں، کیونکہ ہڑتال بھی غیر قانونی قرار دی جا چکی تھی۔ مگر کامریڈ گھمبیر سنگھ نے سارے مزدوروں پر جیسے جادو پھیرا ہوا تھا۔ کوئی بھی ٹس سے مس ہونے کے لیے تیار نہ تھا کیونکہ ان کو پتہ تھا کہ اگر کوئی بھی مزدور کامریڈ کے خلاف مل میں کام پر گیا تو کامریڈ اس کو غدار قرار دے کر اس کے ہاتھ پاؤں تڑوا دے گا۔

مل کا منیجر رام کشن سنگھ اس ہڑتال سے کافی پریشان تھا کیونکہ اس کو خطرہ تھا کہ کہیں اس مل کا لائسنس کینسل نہ ہو جائے جو سارے ہندوستان میں صرف اسی کو ملا ہوا تھا جس کی وجہ سے امپورٹ بھی بند کرادی گئی تھی۔ آرڈر بڑھتے چلے جا رہے تھے اور سپلائی ممکن نہ تھی۔ کامریڈ کو کئی مرتبہ سمجھوتہ کے لیے بلایا مگر جب بھی کامریڈ آیا تو اس کے ساتھ کئی نیتا گن بھی آئے۔ بحثیں ہوتیں مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

ایک دن رام کشن ایک ایسی ہی میٹنگ سے نکلا تو اس نے کامریڈ کو سڑک پر اکیلا جاتے دیکھ لیا۔ فوراً ہی اس کا دماغ ایک کمپیوٹر کی مانند کام کرنے لگا۔ گاڑی کو بریک لگایا اور کامریڈ سے ـــــــ

اُد کامریڈ گھمبیر جہاں جا رہے ہو میں تمہیں چھوڑ دوں ـــــــ

ارے صاحب آپ بڑے آدمی ہیں کیوں ہماری عادتیں خراب کرتے ہیں کامریڈ نے جواب دیا۔
دیکھو بھئی بات سنو! مل کا جھگڑا ایک طرف۔ کیا آدمی آدمی سے مل بھی نہیں سکتا۔ رام کشن نے کہا
نہیں ایسی بات نہیں ـــ پھر بھی ہم کامریڈ ٹھہرے اور آپ مل کے منیجر ـــ ہمیں کاروں میں
بیٹھنا کہاں شوبھا دیتا ہے۔ کامریڈ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا ـــ کشن لال کی تیز نظروں نے بھانپ
لیا۔ اس نے پھر کہا۔ ارے یار کامریڈ تم شاید اس لیے ڈر رہے ہو کہ کہیں کوئی مزدور تمھیں دیکھ نہ لے۔
نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ کامریڈ نے اپنی مونچھوں کو نوکدار بناتے ہوئے کہا۔
تو پھر آؤ ـــ
اچھا بھئی ـــ شاید کامریڈ اسی موقع کی تلاش میں تھا۔
کار کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ رام کشن نے اپنی کار کا رخ شہر کے مشہور ہوٹل تاج کی طرف
کر دیا جہاں اس کے لیے ایک کمرہ ہر وقت ریزرو رہتا تھا۔ تین گھنٹے بعد جب کامریڈ طرح طرح
کے کھانوں سے بھرپور وہسکی کے نشے میں گھر پہونچا تو اس کا دماغ مل میں لگے اس الیکٹرونک کلاک
کی طرح کام کر رہا تھا جس میں ہر سکینڈ ایک جگمگاتا ہوا ہندسہ تبدیل ہوتا تھا۔
گھر میں تین چار کامریڈ اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔
ارے کامریڈ آج کہاں چلے گئے تھے ہم تو کافی دیر سے تمھارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ ان میں
سے ایک بولا۔
ہمیں تو تمھارا فکر ہو گیا تھا۔ دوسرا بولا۔
ارے یار آج ایک پرانے رشتہ دار مل گئے۔ بس تم تو جانتے ہی ہو بہت دنوں میں ملے تھے تو
انھیں کھلا پلا کر سیدھا ہی آ رہا ہوں۔ کامریڈ رگھبیر سنگھ نے جواب دیا۔
کامریڈ رام اوتار نے بیڑی کا منڈل نکالا اور کامریڈ رگھبیر سنگھ کی طرف بڑھایا۔
کامریڈ رگھبیر سنگھ کچھ ٹھٹکا۔ مگر پھر شاید کسی خیال کے آتے ہی بیڑی کا منڈل پکڑ لیا۔
آج کی میٹنگ کا موضوع تھا "اب کیا ہو"؟
مینجمنٹ ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ دینے کو تیار نہیں۔ اور ادھر دکانداروں نے اُدھار بھی دینا
بند کر دیا ہے۔ کامریڈ رگھبیر سنگھ نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ارے روتے کیوں ہو؟ کچھ دن

ادر ٹھہر جاؤ، سب کچھ ملے گا۔

نہیں کامریڈ اب توکھانے کے لالے پڑ رہے ہیں رام اوتار بولا۔

"تو پھر تم لوگ کیا چاہتے ہو"۔؟

یہی کہ کسی طرح سمجھوتہ کر لیا جائے تاکہ آگے کو بیگار مل سکے۔

ہاں کامریڈ اب تو سمجھوتہ ہی کر لو۔ دوسرا کامریڈ بولا۔

تو پھر سنو! میں تمھیں آدھی بیگار دلا سکتا ہوں۔ مگر خالی دو چیروں پر دستخط کرنے ہوں گے۔

کیا ـــــ؟ سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے کیونکہ انھیں اس کی امید نہ تھی۔

لیکن یہ سب کیسے ہوگا؟

یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ کل ہی رام کشن سے مل کر معاملہ طے کرادوں گا۔

ہاں ہاں کرادو۔ سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔

اچھا پھر کل میں جاؤں گا۔ مگر اب کے میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ کامریڈ رگھبیر سنگھ نے اپنی خوشی دباتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول ہی رہا تھا کہ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس کے گاؤں سے اس کے باپ کا تار آیا تھا جس میں اسے فوراً آنے کو لکھا تھا۔ ساری رات کامریڈ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک طرف باپ کا تار۔ دوسری طرف آنے والا کل ـــــ کامریڈ کو وہ رات گذارنا مشکل ہو گئی صبح پوری طرح نمودار بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ رام کشن کے گھر پہونچ گیا ـــ رام کشن نے حسب وعدہ پانچ ہزار کی پہلی قسط اس کو ادا کر دی۔

دس بجے کے قریب جب وہ مل پہونچا تو اس نے تمام مزدوروں کو اپنا منتظر پایا۔

کیا ہوا کامریڈ؟ رام اوتار بولا۔

وہی ہوا جو تم سے شام کہہ کر گیا تھا۔

رام اوتار نے تمام مزدوروں کی طرف دیکھ کر نعرہ بلند کیا۔

کامریڈ رگھبیر سنگھ

زندہ باد ——— زندہ باد ———

رام کشن سنگھ

زندہ باد

مزدور ایکتا۔

زندہ باد۔

ٹوڈی بچہ ——— دور سے ایک آواز آئی۔

رگھبیر سنگھ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ مزدور ہائے ہائے کا نعرہ بلند کرنے ہی والے تھے کہ رگھبیر سنگھ نے انھیں روک دیا اور اُن سب کو مل کے اکاؤنٹس میں جانے کو کہا۔ جہاں روپے ان کے منتظر تھے۔

ڈی، ٹی، یو کی بس نے رگھبیر سنگھ کو گاؤں سے قریب ایک میل کے فاصلہ پر اتار دیا کیونکہ آگے جانے کا راستہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ اس کو بس میں ہی یہ بات معلوم ہو گئی تھی، کہ ڈھانسہ باندھ ٹوٹ چکا ہے جس کے پار اس کا گاؤں تھا اور اب گاؤں کے بچے کھچے لوگ ریلیف کیمپوں میں پڑے ہوئے تھے۔

رگھبیر سنگھ نے جب گاؤں کی طرف دیکھا تو اسے سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ پانی کہاں سے آگیا۔ اتنا پانی تو اس نے زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہاں بھلا پانی کا کیا کام؟ اس نے دس فٹ اونچے ڈھانسہ باندھ کو بنتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور سوائے ان لوگوں کے جن کی زمین ڈھانسہ باندھ میں ایکوائر کر لی گئی تھی سب لوگوں نے اس باندھ کی تعریف کی تھی۔۔۔۔

لیکن اب وہ باندھ کیسے ٹوٹ گیا؟ اب تو وہاں دور تک پانی کے تختہ کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ کہیں کہیں پر کچھ پیڑوں کی پھننگیں نظر آتی تھیں۔ فوج کے سپاہی کشتیوں میں آجا رہے تھے وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسٹیشن پر پی ہوئی چائے اس کے پیٹ میں کلبلا رہی تھی۔ اس کی نظریں بے چینی سے اپنے گھر والوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ کنارے پر کھڑے لوگوں کی بھیڑ میں اسے رامو کاکا دکھائی دیا۔ وہ فوراً ہی ان کی طرف

لپکا ـــــ رامو کاکا ـــــ رامو نے پلٹ کر دیکھا مگر کچھ پہچان نہ پاکر پھر اپنی پوٹلی سنبھالنے لگا۔

اتنی دیر میں رگھبیر سنگھ اس کے قریب پہونچ گیا۔

رامو کاکا پہچانا نہیں میں رگھبیر سنگھ ہوں۔

رامو کاکا نے ایک لمحہ اپنی موٹی عینک میں سے اس کو دیکھا اور روتے ہوئے اس کو لپٹ گیا۔

رگھو ـــ میرے رگھو ـــ ارے تو یہاں کہاں سے آگیا بٹیا ؟

رگھبیر سنگھ کو مارے گھبراہٹ کے اُلٹی سی آنے لگی مگر وہ ضبط کر کے رامو کاکا سے لپٹا رہا۔ جب کچھ ڈھارس سی بندھی تو رامو کاکا اس سے علیحدہ ہوا۔ تب اس نے پوچھا۔ رامو کاکا۔ باپو کہاں ہے؟ ماں کہاں ہے ؟ سیتا اور بچے کہاں ہیں ـــ؟ راجو بھیکو۔ گڑیا سب کہاں ہیں کاکا ـــ؟

بیٹا مجھے پتہ نہیں ـــ کہاں ہوں گے ـــ مجھے تو کچھ لوگ پیپل کے گدّے پر سے اتار کر لائے ہیں۔ کل رات پانی اتنی تیزی سے گاؤں میں آیا کہ سب لوگ تتر بتر ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے سارا گاؤں ڈوب گیا۔ چند ہی لوگ بچے ہوں گے۔

مگر کاکا یہ سب کیسے ہو گیا ـــ؟ رگھبیر سنگھ نے چلانا چاہا مگر اس کی آواز جیسے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

رگھو مجھے کیا پتہ ـــ یہ تو بھگوان ہی جانے۔ کاکا نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا ـــ بھگوان۔ بھگوان۔ کاکا ابھی تک تمہیں بھگوان کی لالسا نہیں گئی۔ رگھبیر کے اندر کا کارل مارکس بول پڑا۔ یہ سب سرمایہ داروں کے پاکھنڈ ہیں جو انھوں نے محنت کش عوام کو زنجیروں میں جکڑنے کے لیے بنائے ہیں۔ بھگوان ـــ قسمت ـــ دھرم ـــ کرم ـــ وہ بڑبڑایا ـــ رامو کاکا یہ سب سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے پلٹ کر اپنی گٹھری اٹھائی اور چل دیا۔

سنتری صاحب کچھ آپ ہی بتائیے۔ اس نے پاس کھڑے ہوئے ایک فوجی نوجوان سے پوچھا۔ فوجی نے گمبھیرتا سے جواب دیا۔ بیراج کا دروازہ نہ کھل سکنے کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے لیکن

بیراج کا دروازہ کیوں نہیں کھلا؟ کیا ہوا ——— ؟ یہ بات رگھبیر سنگھ کی سمجھ سے دور کی بات تھی۔ ان سنی کرتا ہوا وہ بھاری قدموں سے دوسری طرف چل دیا۔

قریب ہی کھڑے دو تین لوگ اخبار لیے باتیں کر رہے تھے۔ راجندر سنا تم نے یہ کیا لکھا ہے کان پور ربر مل میں تین ماہ سے ہڑتال چل رہی ہے جس میں بیراج میں لگنے والی ربڑ بنتی ہے۔ یہ سب اسی ہڑتال کی وجہ سے ہوا۔

رگھبیر سنگھ کے کانوں کو یہ آواز تیر کی طرح چھید گئی۔ اسے یاد آیا کہ کان پور ربر مل ہی صرف ایسی ربر بناتی ہے جو بیراج کے کھلنے اور بند ہونے کے کام آتی ہے۔ اسے چکر سا آیا وہ لڑکھڑایا اور پانی میں گر گیا لوگ اسے بچانے کے لیے بھاگے۔

اسے باہر گھسیٹ لیا گیا۔ وی آئی پی بیگ ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں بہہ گیا۔ دوسرے ہی لمحہ جب اس کو ہوش آیا تو اس نے بیگ کو پانی میں ہچکولے کھاتے دیکھا جس میں منیجر رام کشن کے دیئے ہوئے پانچ ہزار روپے بھرے ہوئے تھے۔ اسے لگا وہ ایک پینڈولم کی طرح معلق ہوا میں لٹکا ہوا ہے۔ شاید وہ بالکل سرد ہو جاتا اگر بچے چلاتے ہوئے بابو بابو کہہ کر اس کی ٹانگوں سے آکر نہ لپٹ گئے ہوتے، اس نے بھیکو کو سیتا کی گود سے چھین لیا اور دیوانہ وار بچوں سے لپٹ کر انھیں چومنے لگا۔ وہ ماں اور باپو کے لیے تڑپ اٹھا۔ اس کی آنکھوں سے نہ تھمنے والا سیلاب جاری تھا۔
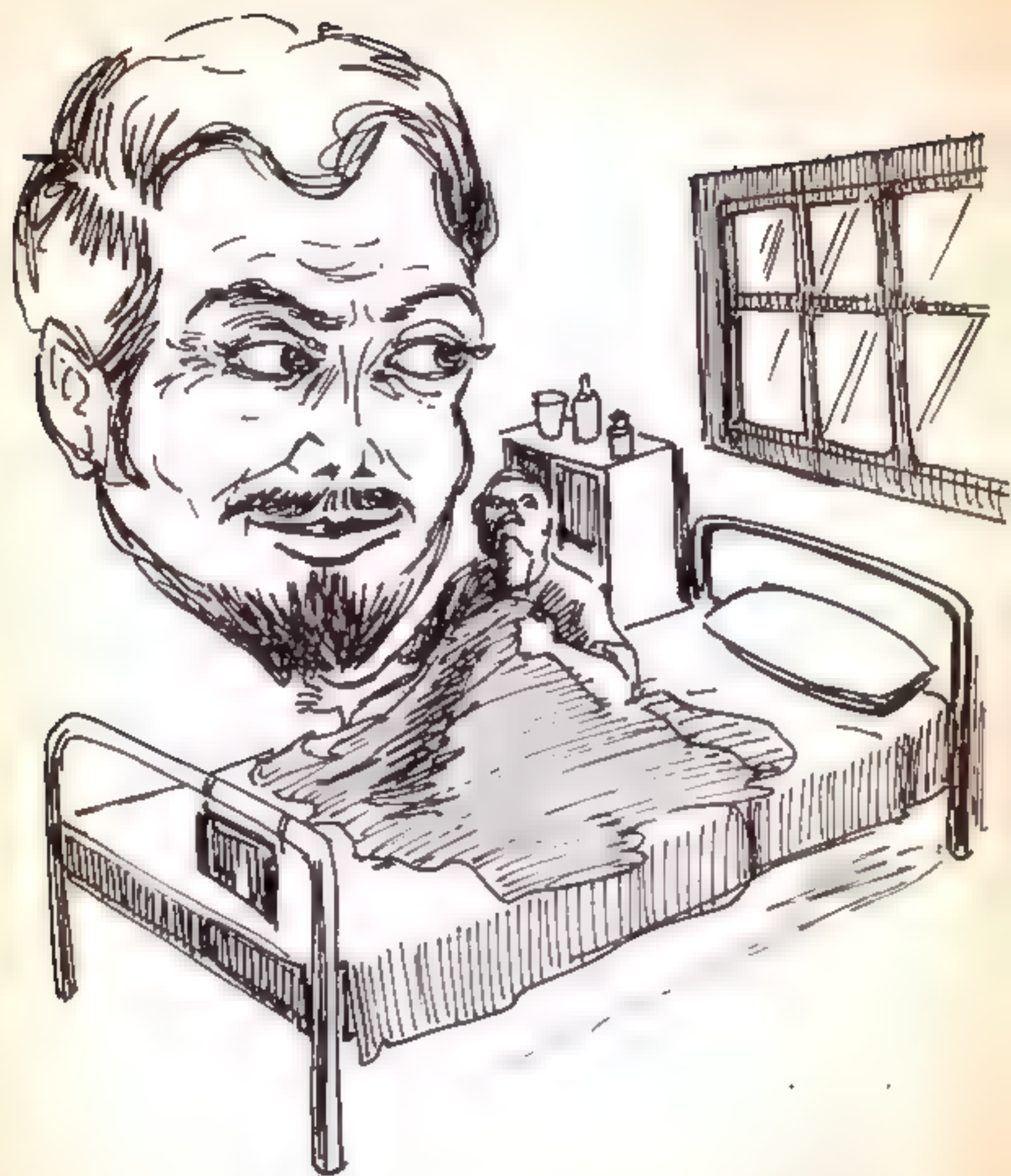
زخم

انتہائی درد و کرب میں تڑپتے ہوئے میرے لیے ڈاکٹر کوجیہ کی مسکراہٹ ایک ایسی زہریلی کڑواہٹ تھی جو زخم پر نمک کا کام کر رہی تھی۔ طبیعت میں کئی دفعہ خیال آیا کہ ڈاکٹر کے منہ پر ایک ہتھوڑا مار کر ساری بتیسی نکال دوں اور اس کو اسی درد و کرب کا احساس دلا دوں جس میں میں مبتلا تھا۔ میں دل ہی دل میں بڑبڑایا "خدا کرے تجھے بھی کینسر ہو جائے۔" لیکن جلد ہی میں نے صبر کر لیا ایک امید موہوم مجھے اس کام سے روک دیتی تھی کیونکہ ڈاکٹر کوجیہ ہی صرف وہ ڈاکٹر ہے جو کینسر کا اسپیشلسٹ ہے اور صرف وہی میرے اس ناسور کو اچھا کر سکتا ہے۔

کینسر کا یہ اسپیشل وارڈ میرے لیے نیا نہ تھا۔ کافی دنوں سے میں اس کے صاف و شفاف فرش کو گھسے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ سارے مریض بھی مجھ سے اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے میں مدتوں سے اسی وارڈ کا کوئی پاٹ ہوں جس میں ہر کوئی آ کر اپنے زخمی جذبات کی قے کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر کنوجیہ کی شخصیت ایک ایسا معمہ تھی جس کو کوئی بھی نہ حل کر سکا۔ خاموش طبیعت پھیکی پھیکی مسکراہٹ جو کبھی کبھی زہریلی بھی ہو جاتی۔ مریضوں میں حد درجہ کی دلچسپی۔ صبح سے شام تک لاتعداد کافی کے کپ۔ اسپتال کا وقت ختم ہو جانے پر ایک ایک کر کے سب ہی اسپتال سے چلے جاتے لیکن ڈاکٹر کنوجیہ گھنٹوں اپنی کرسی پر خاموش بیٹھا رہتا اور جب کوئی اردلی یا ایمرجنسی ڈیوٹی کا ڈاکٹر ادھر سے گذرتے ہوئے ٹوکتا تو وہ پھیکی پھیکی مسکراہٹ سے اپنی جگہ سے اٹھتا گاڑی نکالتا اور چل دیا کرتا۔

اسپتال میں داخل ہوتے وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب یہاں سے واپس نہ جا سکوں گا درد کرب، تڑپ و گھٹن، زندگی اور موت ....

اور اس کے اوپر ڈاکٹر کنوجیہ کی مسکراہٹ کا ڈنک ....

میرا درد اور بڑھ گیا۔ میرے زخم میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

کئی روز مجھے اسپتال میں داخل ہوئے ہو چکے تھے۔ میرے آپریشن کے صرف بارہ گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر کنوجیہ راؤنڈ پر آنے والا تھا اور میں بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر............ کیا میں بچ سکوں گا ڈاکٹر..........؟

درد کی شدت سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ مجھے بہت سخت تکلیف ہے ڈاکٹر.....

اگر میں .... میں مر گیا تو ......

تو شاید .... شاید میں ....

میں پریشانی کی حالت میں بڑبڑائے جا رہا تھا اور کنوجیہ کی نگاہیں بہت غور سے میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں بار بار اپنا جملہ دہرا رہا تھا۔

کیا میں بچ سکوں گا ڈاکٹر......؟

پلیز ڈاکٹر ...... کچھ تو بولئے ......

۔آپ بولتے کیوں نہیں ڈاکٹر ......

وہی زہریلی سی مسکراہٹ ...... ہر مرتبہ سے کچھ زیادہ ہی

.میں اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر تڑپتے ہوئے تقریباً چیخا

"ہوں "۔ ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے گردن کو جنبش دی —— اور میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہ دن بھی آگیا جب مجھے دوسری زندگی مل گئی۔ میرا آپریشن ہوگیا۔ زخموں کا مواد نکل جانے سے مجھے اس جان لیوا درد سے نجات مل گئی جو مجھے زندہ درگور کئے ہوئے تھا۔ کچھ دن بعد مجھے اسپتال سے چھٹی مل جانی تھی لیکن اسپتال اس کے کمروں اور مریضوں سے لے کر وہاں کے نوکروں، اردلی اور یہاں تک کہ جھاڑو لگانے والے منگلو تک سے مجھے انسیت ہوگئی تھی اور شام کی ڈیوٹی والی وہ نرس ...... ہائے ...... گورا گورا گول گول مکھڑا ابھرا ابھرا گداز جسم اور میٹھی میٹھی باتیں۔ اس کے ہاتھوں کا لمس۔ بھلا سا نام "شنو" بھلا یہ سب میں کس طرح بھول سکتا تھا ان سب کو چھوڑتے ہوئے مجھے ایک شدید کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ بیس دن کتنی جلدی گذر گئے اس دن ڈاکٹر کنوجیہ راؤنڈ پر نہیں آئے تھے ورنہ تو میری چھٹی بھی اس دن ہوگئی ہوتی۔ میرے علاوہ کمرے میں صرف تین مریض باقی رہ گئے تھے۔ دو مریض آرام سے سرخ کمبل تانے سو رہے تھے اور ایک کبھی کبھی آنکھیں کھولتا اور موند لیتا۔ شاید وہ میری اور شنو کی باتیں سن رہا تھا۔ ہم دونوں خاموشی اور تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے محو گفتگو تھے۔

آج دل بھر کر باتیں کر لو شنو کل تو میں چلا جاؤں گا اگر ڈاکٹر کنوجیہ آج ڈیوٹی پر ہوتے تو یقیناً میری چھٹی کر گئے ہوتے۔ شنو نے ایک سرد آہ کھینچی۔ کنوجیہ بچارا کہاں سے آجاتا آج۔ کیوں کیا ہوا اسے ......؟ اس کی زندگی کا ایک ہی سہارا باقی رہ گیا تھا وہ بھی نہ رہا ...... بڑی لمبی کہانی ہے اس بے چارے ڈاکٹر کی ......

کہانی —— کیسی کہانی —— مجھے بھی بتاؤ ——

میں نے شنو کو کھینچ کر اپنے قریب بٹھالیا۔ مجھے ڈاکٹر کی شخصیت بڑی پر اسرار سی محسوس ہونے لگی۔

کیا ہوا ——

میں نے بیتابی سے پوچھا؟ ــــــــــــ

مجھے تو خود معلوم نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے پرانے نوکر سے ایک دن ان سب باتوں کا پتہ چلا۔ ورنہ کنوجیہ کسی کو کچھ نہیں بتاتے۔

لیکن کیا ــــ

مجھے بھی تو بتاؤ ــــــــ

اور پھر شنو نے کہنا شروع کیا ــــــ

ڈاکٹری کے بعد کنوجیہ کی پریکٹس کا پہلا ہی سال تھا کہ اچانک ان کی چاہنے والی وہ ماں جس نے شوہر کے بعد لاتعداد مصیبتوں کو سہتے ہوئے اس پودے کی آبیاری کی تھی اس کی چھایا سے محروم ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ایک چھوٹا بھائی جو بخار میں ہوا لگ جانے سے آج تک فالج زدہ پڑا ہے اسے کوئی آرام نہ ہو سکا۔ کنوجیہ تن تنہا اس دنیا میں اکیلے رہ گئے تھے۔ بوڑھے بابا (نوکر) نے رو رو کر منت سماجت کر کے کنوجیہ کی شادی کرا دی۔ جس سے کنوجیہ کی زندگی کا رخ بدل گیا۔ نئی زندگی کی نئی ساتھی کسی سورج کی کرن کی طرح اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اس کا نام بھی تو کرن تھا۔ غم خوشیوں میں تبدیل ہونے لگے۔ پھول سا مسکراتا کلکاریاں بھرتا ایک بچہ ان کے چمن کی زینت بن گیا۔ اس کے قہقہے کنوجیہ کی زندگی بن گئے۔ پھر دوسرا پھول کھلا ــــــ مگر ــــ اس طرح کہ شاخ گل لچکی اور ٹوٹ گئی ــــــ نہ ماں رہی نہ بچہ ــــ

اوہ ــــــــ

میرے مندمل زخم میں ٹیس اٹھنے لگی تھی۔ پھر کچھ ــــــــ

اور بچہ؟ ــــــ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا

بچہ؟ ــــ جسے کنوجیہ کسی بیوہ ماں کی طرح پال رہے تھے کل صبح بس کی زد میں آ گیا۔

زرین کے آخری جملے پر مجھے زور کی جھرجھری آئی اور میں سردی سے کپکپانے لگا۔ مندمل زخموں میں سے شاید پھر پیپ رسنے لگی تھی۔ میرا سارا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا اور شنو بھی رومال سے اپنے آنسو خشک کر رہی تھی۔

ڈاکٹر کی زہریلی مسکراہٹ کی وجہ سن کر مجھے ایک ایسی بے چینی کا احساس ہوا جو اس سے پہلے

حل ہونے سے پہلے بھی نہ تھی۔ شاید اس میں کچھ احساس شرمندگی بھی شامل ہوگیا۔ اس رات میں سو نہ سکا اور بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ میں بہت جلد ڈاکٹر سے ملنا چاہتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں کنوجیہ کے سارے غموں میں حصہ دار بن جاؤں اور تیسرے دن جب کنوجیہ میری چھٹی کر چکے تھے تو میں اس پراسرار شخصیت سے ملنے اس کے کمرے میں خود ہی چلا گیا۔ میں نے پردہ کھسکایا تو دیکھا کہ کنوجیہ اپنی جگہ بیٹھے تھے میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ کافی کا کپ ڈاکٹر کے سامنے میز پر رکھا تھا ایش ٹرے میں پڑا سگریٹ آخری سانسیں لے رہا تھا اور کنوجیہ کسی گہرے تصور میں غرق تھے۔

ہلو ڈاکٹر ——— کوئی جواب نہ ملا ———

ہلو ڈاکٹر صاحب ——— خاموشی ——— کوئی جواب نہ ملنے پر میں نے غور سے کنوجیہ کی طرف دیکھا ان کی آنکھیں بند تھیں ایک زہریلی سی مسکراہٹ اب بھی ان کے ہونٹوں سے نمایاں تھی۔ ان کے زخموں کا آپریشن ہو چکا تھا، سارا مواد نکل چکا تھا اور وہ سکون سے ابدی نیند سو رہے تھے

نوکری

ہر روز کی طرح اخبار میں وانٹس کا کالم دیکھا اور پھر باقی پیپر پر نظر ڈالی "یہ دنیا چڑیا گھر ہے" موٹی موٹی سرخی پر خود ہی نظر چلی گئی۔ کیا خوب مضمون لکھا ہے۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ بھارت میں چودہ چڑیا گھر ہیں۔ دلی کے چڑیا گھر کی استھاپنا ایک نومبر ۱۹۵۹ء میں ہوئی یہ ۲۱۴ ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ جانوروں کے رکھ رکھاؤ اور پرندوں پر ہر سال تیس لاکھ روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ ہر جانور کو اس کی عادت کے مطابق غذا کھلائی جاتی ہے جہاں مینا کے لیے چھٹانک بھر اناج کافی ہے تو ہاتھی کو ایک کوئنٹل ہرا چارا اور ایک کلو گڑ کھلایا جاتا ہے۔ چڑیا گھر میں پانچ شیر ہیں۔ ببر شیر چوبیس گھنٹے میں ایک بار ایک ساتھ پندرہ کلو ماس کھا جاتا ہے، چیتا صرف آٹھ کلو سے دس کلو تک ماس کھاتا ہے۔ دلی کے چڑیا گھر میں افریقہ کے بن مانس خاص دیکھنے کی چیز ہیں ایک نر اور دو مادہ ہیں ایک بن مانس کا پانچ مہینے کا بچہ بھی ہے۔ ان کی خاص غذا ڈبل روٹی، کیلا، سنترا، سیب اور دودھ ہے یہاں دو کالے امریکی اور تین بھورے رنگ کے تیندوے ہیں تیندوا ایک دن میں پانچ کلو گرام ماس کھاتا ہے، مگر مچھ سات انچ سے نو انچ لمبی مچھلی دو کلو گرام ہر روز کھاتا ہے۔ ایک اود بلاؤ ہر روز ایک کلو گرام مچھلی کھاتا ہے۔ چڑیا گھر میں سات اود بلاؤ ہیں۔ لکڑ بگا ایک کلو گرام ڈبل روٹی آدھا لیٹر دودھ اور تین کلو ماس ہر روز کھاتا ہے۔ بھالو کی غذا پانچ سو گرام دودھ ڈھائی گرام ککڑی اور ڈھائی سو گرام ابلے آلو ہے۔

چڑیا گھر میں مختلف نسل کے طوطوں کی تعداد تیس ہے ایک طوطے کا کھانا ہر روز پانچ گرام ہری مرچ پچاس گرام مولی پچاس گرام مونگ پھلی ایک کیلا اور امرود ہے۔

مختلف بندروں کی تعداد یہاں ساٹھ ہے۔ ہر بندر صبح کو سو گرام ڈبل روٹی سو گرام دودھ کا ناشتہ کرتا ہے اس کے علاوہ ہر روز سو گرام بھیگے چنے دو کیلے پچاس گرام کھیرا پچیس گرام پیاز، پچیس گرام ٹماٹر سو گرام ابلے آلو سو گرام ہرے پتے سو گرام پپیتا اور مٹھائی کھلائی جاتی ہے۔

گبن نامی بن مانس کو اور بندروں کے علاوہ ایک انڈا بھی ہر روز کھلایا جاتا ہے۔ بن مانس صبح ناشتہ کرنے سے پہلے ایک سیب بھی کھاتا ہے ناشتے میں ڈھائی سو گرام ڈبل روٹی ڈھائی سو گرام دودھ اور ایک انڈا کھاتا ہے دوپہر اور شام کو پانچ سو گرام ملا جلا دانا دو کلو گرام پیڑوں کی جڑیں اور دو کلو گرام چارا کھاتا ہے۔ اس کے علاوہ کیلا انگور پپیتا وغیرہ بھی کھاتا ہے۔ پڑھتے پڑھتے میرے منہ میں پانی بھر آیا یہاں تو ہر روز ناشتہ میں وہی باسی روٹی چائے کے ساتھ کھا کر پیٹ پر ہاتھ پھیر لیا جاتا تو کبھی قسمت میں صرف پندرہ بیس پیسے کے چنے ہی کھا کر پانی پی لینا ہوتا۔ دوپہر اور شام کا کھانا تو اور بھی ماشاء اللہ ہوتا۔ کبھی دوپہر کا نذارد تو کبھی شام کو بھوکے لیٹ رہے ہوتے۔ نئے شہر میں اور وہ بھی نوکری کی تلاش میں کب تک گذارا ہوتا۔

اس وقت اپنی ایم اے کی ڈگری بے کار لگنے لگی ہم سے اچھے تو یہ چڑیا گھر کے جانور ہیں جو ہر روز اپنی پسند کے مطابق مزے مزے کا کھانا کھاتے ہیں۔ دل میں بجلی کی طرح ایک خیال کوندا کہ کیوں نہ قسمت آزمائی کی جائے ایسا جانور ——————— چڑیا گھر میں آج تک کسی نے نہیں دیکھا ہوگا جس کے نام کے ساتھ ڈگری بھی لکھی ہوگی۔ جو لکھ پڑھ سکتا ہے اچھی بولی بول سکتا ہے۔ سب سے ہاتھ ملا کر مزاج پرسی کر سکتا ہے کام بن گیا تو اچھی غذا بھی کھانے کو ملے گی۔ دھوپ اور بارش سے بچاؤ بھی ہوگا اور بیمار پڑیں گے تو علاج بھی ہوگا۔ غرض کہ مزے ہی مزے ہوں گے۔

سارا دن اسی اچھے اچھے کھانے کے تصور میں ایسا گذرا کہ بھوک کی شدت اور بڑھ گئی اور رات گذارنا مشکل ہوگیا۔ صبح ہوتے ہی میں چڑیا گھر کے ڈائریکٹر سے ملا۔

میری پیش کش سن کر وہ حیرت سے ہنسا اور مجھے پاگل قرار دینے لگا۔ اب تو مارے غصہ کے دم ہی پھول گیا یعنی ہم پڑھے لکھے ایم اے کامرس میں فرسٹ نمبر آپ کو پاگل نظر آتے ہیں۔ انسان بھی تو ایک جانور ہے۔ سب جانوروں سے بہتر جانور عمدہ قسم اور کوالٹی کا جانور۔ کتنے عمدہ عمدہ جانور چرند پرند بھی چڑیا گھر میں موجود ہیں۔ سوائے اس اول قسم کے جانور کے۔ میری بہت ساری دلائل سن کر ڈائریکٹر صاحب نے سوچنے کی مہلت مانگی اور تین دن بعد آنے کو کہا۔

تین دن تین ماہ اور تین سال کی طرح ہوگئے۔ مجھے نوکری ملنے والی تھی اور میں اس کے تصور سے ہی خوش تھا مقررہ وقت پر میں ڈائریکٹر صاحب کے پاس پہونچ گیا۔

تمہارا کیا نام ہے .... ؟ بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد یہ ان کا پہلا سوال تھا۔

عابد ....

بہت خوب ...... تو آپ چڑیا گھر میں رہنا پسند کریں گے ؟

زہے نصیب ....

لیکن ہم نے کچھ اور سوچا ہے۔

وہ کیا جناب ——— میں نے بے چینی سے پوچھا۔

ہم نے سوچا ہے تمہیں میوزیم آف نیچرل ہسٹری بھیج دیا جائے۔ انسانی ارتقا میں ہر اسٹیج کے نمونے موجود ہیں وہاں اگر کمی ہے تو صرف آدی مانو کی۔ آپ آدی مانو بننا پسند کریں گے ؟

یعنی بڑھی ہوئی داڑھی، بڑھے ہوئے بال، ننگا جسم، چھال کی لنگوٹی، ہاتھ میں پتھر یا لکڑی کا ہتھیار، اور زور سے چنگھاڑنا وغیرہ وغیرہ .... انھوں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کھڑکیاں دروازے بند کرکے ایک پروجیکٹر چلا دیا۔ اس میں انسانی ارتقا کی کہانی کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ مختلف قسم کے بندر بن مانس ان کا رہن سہن کھانا وغیرہ سب کچھ دکھایا گیا تھا۔ اس میں ہمیں کرومیگنن نسل کی نمائندگی کرنی تھی۔ جسم پر بڑے بڑے بال داڑھی اور مونچھوں کا فرق ختم گرگرڈیں ڈیں آواز نکالنا کھانا پینا سب اسی کی طرح کرنا تھا۔ بدن میں ایک جھرجھری سی آئی اور چلی گئی۔ اس منظر کو کئی دفعہ مجھے دکھایا گیا ملازمت کی شرط یہی تھی کہ بالکل ایسی ہی حرکات کی جائیں۔ فرق یہ تھا کہ اس ایکٹر نے یہ حرکات صرف ایک بار کی تھیں۔ مجھے روزانہ اور بار بار کرنی تھیں۔

سوچ لیجئے ! ڈائریکٹر نے کہا اور پروجیکٹر آف کر دیا۔ کمرے میں روشنی ہوگئی۔

ہم تو سوچ کر ہی آئے تھے پھر بھی پوچھ لیا۔ تنخواہ کیا ملے گی ؟

تین سو روپیہ ٹھیک۔ آدی مانو الاؤنس ۲۰۰ ہفتہ میں ایک دن کی چھٹی اس زمانے کے انسان کا کھانا ناشتہ چائے وغیرہ سب مفت ——— سب کچھ معقول تھا منظور تھا لہٰذا ہمیں تین مہینے کے پروبیشن پریڈ پر پریکٹس کیلئے رکھ لیا گیا۔

وقت کا پنچھی اڑتا گیا تین ماہ گذر گئے تو میری نوکری پرمانٹ ہوگئی نوکری کیا تھی لوہے کے چنے چبانا تھی میرے گھر والوں کو یہ علم ہے کہ کسی اچھے عہدے پر ملازم ہوں میرے پاس سے ہر ماہ معقول رقم ان کو پہنچ جاتی ہے۔ دونوں بہنوں کی شادی ہوگئی ماں کی آنکھیں بن گئیں اب وہ بہو کی تمنا میں بے چین ہیں۔

میری خاموشی ان کی سمجھ سے باہر ہے۔

فریڈم فائٹر

فریڈم فائٹر

جے چند سارمی سے میری ملاقات ایک ملاقات نہ تھی بلکہ ایک اتفاقیہ ٹکراؤ تھا۔ میرے شوہر کسی کام سے تیس ہزاری کورٹ گئے تھے اور میں ان کے ساتھ تھی۔ چونکہ وہاں کچھ دیر تھی تو ایک زینہ سے لگ کر ہم دونوں ہی وہاں کی بھیڑ اور پریشان و جلد باز چہروں کو تک رہے تھے کہ یکایک ایک ریلے میں ایک مختصر اور پتلا دبلا سا بوڑھا سفید بڑے بڑے بال سفید داڑھی اور سفید کپڑوں میں ملبوس عمر تقریباً ستر سے اوپر ہوگی۔ کچھ مختلف سا نظر آیا۔

آنکھوں پہ چشمہ چڑھائے ہاتھ میں رجسٹر لئے کچھ بڑبڑاتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اسے راستہ دیا اور تھوڑا ہٹ کر کھڑی ہوگئی ـــــــ وہ وہیں رک گیا اور بڑبڑانے کے انداز میں کچھ کہنے لگا۔ میرے شوہر نے یوں ہی پوچھ لیا کیا بات ہے ؟ ؟

پھر غلط کردیا ـــــــ نام ہی غلط ہے تو یہ جائے گا کہاں ؟ اب پھر اس کو ٹھیک کرا کے لاؤں۔

کیوں ـــــــ صاف تو لکھا ہے اِنھوں نے ایک نظر اس تحریر پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

نہیں ـــــــ یہ نام نہیں ـــــــ نام یہ ہے ـــــــ

پھر تو ٹھیک کرانا پڑے گا اِنھوں نے اس کی بات کی تائید کی۔

اس بوڑھے نے وہ تمام لیٹرس ان کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

میں نے اچک کر دیکھا وہ کئی لیٹرس تھے اور ان میں پولیس افسروں کو خطاب کیا گیا تھا۔

یہ لیٹر کیوں بھیج رہے ہیں آپ ؟ اِنھوں نے سوال کیا۔

میں نے اپنے نقصان کا دعویٰ کیا ہے۔ اس لئے ان کی گواہی ضروری ہے۔

آپ کا کیا نقصان ہوگیا ہے ؟ ـــــــ

مجھے انھوں نے ایمرجنسی میں گرفتار کر لیا تھا۔ چھ مہینے تک جیل میں رکھا۔ جس نے پکڑا تھا وہ اب ڈسمس ہو گیا ہے۔ تو میں نے دعویٰ کر دیا۔

آپ کو کیوں پکڑ لیا تھا؟

میں گئو رکھشا کے سلسلہ میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

مجھے انھوں نے آدھی رات کو اٹھایا اور کہا کر چلو تمھیں S.H.O بلاتے ہیں۔ میں نے پوچھا کیوں؟۔ کہنے لگے وہیں جا کر پوچھ لینا۔ میں نے پوچھا کوئی تحریری وارنٹ لائے ہو؟ لیکن ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔

میں نے کہدیا میں نہیں جاتا ——— تب وہ باوردی سپاہی جا کر پولیس وین لائے اور مجھے زبردستی اٹھا کر لے گئے۔ وہاں انھوں نے مجھ پر کیس بنایا کہ میں ایک جلسہ میں گئو رکھشا کی حمایت میں حکومت کے خلاف تقریر کر رہا تھا۔

یہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے اور میں سنتی جا رہی تھی۔ میں نے بھی ایک سوال پوچھ کر مداخلت کی۔

بابا ——— آپ نے جوتے، چپل کچھ بھی نہیں پہن رکھے۔ کیا کچھ تکلیف ہے آپ کو؟

تکلیف ——— اس کی بوڑھی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوئی ——— اس لیے کہ میں نے پرن کیا ہے کہ جب تک رام راج نہیں ہو گا۔ ہزاروں گؤ ماتائیں کٹنی بند نہیں ہوں گی میں جوتے نہیں پہنوں گا۔

میں حیرت سے اس کا منہ تک رہی تھی کہ اگلا سوال میرے شوہر نے کر ڈالا۔

اور یہ جو آدمی ذبح ہو رہے ہیں، ان کے بارے میں آپ کیوں نہیں کہتے؟

اس سوال پر اس کے بوڑھے چہرے میں تمام خون کی حدت سمٹ آئی۔ اس نے جواب دیا۔

ہاں اس کے بارے میں بھی لکھ چکا ہوں اور یہ کہہ کر اس نے ان ناموں کی ایک لمبی فہرست گنا دی جن جن کو وہ لکھ چکا تھا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور سائکلو اسٹائل کیا ہوا پرچہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تو کیا ہوا اس لیٹر کا؟" انھوں نے سوال کیا۔

ابھی تک تو کوئی جواب نہیں آیا۔ آئے گا بھی نہیں "

پھر ؟.....

میں پھر لکھوں گا۔ اگر میرے بتیس سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے تو گدی چھوڑ دو۔ ہمارے ہاتھ میں پستول دو۔ بندوق دو۔ بم دو۔ وہ بہت کچھ کہتا چلا جا رہا تھا۔

بابا! آپ جن سنگھی ہیں یا کانگریسی ؟ یوں ہی میرے منہ سے نکل گیا۔

نہیں نہیں ۔۔۔۔ میں کانگریسی ہوں۔ کانگریسی تو میں اب بھی ہوں اور ۱۹۴۲ء سے پہلے بھی تھا۔ اور کانگریسی ہی مروں گا۔ میں فریڈم فائٹر ہوں۔ میں نے سات سال جیل میں گذارے ہیں۔

تو آپ کو پنشن بھی ملتی ہوگی ــــ ؟

ہاں وہ تو ملتی ہے۔ بس پاس بھی ہے۔ ریلوے پاس بھی ہے۔ اس نے جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

تو پھر آپ کیوں پریشان ہیں ؟ گورنمنٹ آپ کو اور بہت کچھ بھی دے سکتی ہے۔ میں نے اس کو دلاسہ دینے کی غرض سے کہا۔

کیا مطلب ؟ ـــــــ وہ غرّایا ـــــــ کیا میں نے اس سب کے لیے اتنی محنت کی تھی۔؟ کیا میں نے جیلوں میں اتنی مشقت صرف اس کے لیے کی تھی۔ "رام راج کہاں ہے "؟ وہ مجسم سوال تھا۔

میری آنکھوں کی نمی اس کا جواب دینے کی ناکام سی کوشش کر رہی تھی ــــ کہ وہ بڑبڑاتا ہوا چل دیا ہم دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس کا سائکلو اسٹائل کیا ہوا خطاب بھی میرے سامنے پڑا ہے اور میں سوچ رہی ہوں کیا کرسیوں کے متوالے اس بوڑھے کے جذبات کو سمجھ سکیں گے ـــــــ ؟؟

زرد پتّے
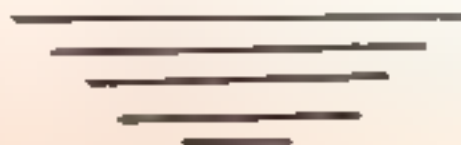
میں دریا گنج بس اسٹاپ پر اتری اور اپنے شوہر کے اترنے کا انتظار کرنے لگی وہ نہ معلوم بھیڑ میں کہاں پھنس گئے تھے۔ اسی بس میں پیچھے چڑھنے والی بھیڑ پر نظر گئی تو اضطراب اور حیرانی بڑھ گئی۔ وہی قد وہی چال نقاب سے جھلکتا بالکل وہی چہرہ۔ نسیم آپا نسیم آپا ـــ ـــ ـــ میں نے دوڑ کر ان کو پکڑنا چاہا ـــــــ وہ بس میں چڑھ چکی تھیں اور بس چل چکی تھی ـــــــ میں نسیم آپا نسیم آپا پکارتی رہ گئی اور تجسّس میں چند قدم بس کے پیچھے بھی دوڑی ـــــ اتنے میں یہ بھی بس سے اتر چکے تھے پوچھنے لگے کیا بات ہے۔ کون تھا۔۔۔۔ ؟

کیا بتاؤں آپ جانتے ہی نہیں ـــــ پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔

شاید نسیم آپا تھیں۔

کون نسیم آپا ـــــــ کوئی رشتہ دار ہیں کیا ؟

میں نے ایک سرد آہ کھینچی ـــــــ ہاں بھی اور نہیں بھی ـــــ وہ ہمارے والد کے بہت عزیز گہرے دوست کی لڑکیاں ہیں۔ دو بہنیں ہیں ایک تو وہیں اپنے شہر میں رہتی ہیں اور دوسری یہاں دہلی میں کہیں سروس کرتی ہیں، آرٹسٹ ہیں۔

کیا نام لیا تم نے نسیم ؟ انھوں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا وہ تو نہیں، جو کسی ہندو کے پاس رہتی ہیں۔ ؟

ہاں ہاں وہی آپ جانتے ہیں کیا ؟

خوب جانتا ہوں۔

آپ کیسے جانتے ہیں ؟ وہ مسکرائے۔

اور انھوں نے یوں اپنی شیخی بگھاری، دہلی کا کونسا ایسا آرٹسٹ ہے جسے میں نہیں جانتا۔

مذاق نہ کیجیے۔ سچ بتائیے آپ کیسے جانتے ہیں؟
میرے کئی مرتبہ پوچھنے پر انھوں نے بتایا "ماموں اسی دفتر میں ملازم ہیں ایک دن مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ چلو ایک لڑکی دکھاؤں پسند آجائے تو آگے بات بڑھے تم بھی آرٹسٹ ہو وہ بھی آرٹسٹ ہے۔ لڑکی اچھی ہے اور شریف بھی ہے۔۔۔۔۔۔ نسیم ہی نام بتایا تھا۔۔۔"۔۔
پھر کیا ہوا؟ میں نے بے چینی سے پوچھا۔
انھوں نے ایک ہی جملہ میں بات ختم کر دی ـــــ "وہاں مجھے زندگی کے آثار نظر ہی نہیں آئے" ـــــ
ان کے لئے تو بات آئی گئی ہو گئی مگر میری ساری رات نسیم آپا شمیم آپا کی گذری داستان میں غرق ہو گئی ـــــ ان کے گھر کے مناظر اپنے بچپن کی یادداشتیں سب خلط ملط ہو کر رہ گئیں
چچا محمد احمد ہمارے سگے چچا تو نہیں تھے لیکن والد صاحب کے خاص دوستوں میں شمار کئے جاتے تھے بہت اچھی طبیعت کے مالک تھے ایک اچھے آرٹسٹ شاعر اور فوٹو گرافر تھے۔ والد صاحب سے ان کی بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ یوں بھی وہ اکیلے تھے، بیوی کا انتقال ہو چکا تھا دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی نسیم آپا چھوٹی شمیم آپا دونوں کی پرورش میں چچا نے اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی تھی۔ ایک ایک پیسہ نہایت کنجوسی سے جوڑتے کہ کسی اچھے گھر بیٹی بیاہنے کے لیے یہ سب ضروری تھا، خالی بیٹی کو کون لے جاتا۔
ہم جب بھی عید پر سویاں اور بقرعید پر گوشت لے کر چچا کے یہاں جاتے تو نسیم آپا شمیم آپا بے انتہا پیار کرتیں، بہت سی باتیں کرتیں جیسی کہ بچوں سے کرتے ہیں۔
تمہارے کپڑے کس نے سیے ہیں۔ چوٹی کس نے باندھی ہے۔ یہ پھول پھول کے کپڑے تو کبھی ہمیں دے دو۔ دیکھو ہمارے پاس ہیں ہی نہیں۔ اور میں اپنے ریشمی کپڑوں کا مقابلہ ان کے میلے کھردرے ملیشا کے کپڑوں سے کرتی تو میرا دل اندر ہی اندر دکھی ہونے لگتا۔ وہ ہمیشہ ملیشیا کے کپڑے پہنتی تھیں اور ململ کا بڑا دوپٹہ مع سر کے چاروں طرف سے لپیٹے رہتی تھیں۔ میں سوچا کرتی، آہ ـــــ بے چاری نسیم آپا کی امی مر گئی ہیں اس لئے کون کپڑے سیئے اور کون چوڑیاں اور ہار بندے لا کر دے ـــــ میں چونکہ چھوٹی تھی اس لئے اس کے علاوہ اور کچھ نہ سمجھ پاتی۔

نسیم آپا چچا کے ساتھ بیٹھی برابر ہی آرٹ کا کچھ نہ کچھ کام کرتی رہتی تھیں اور شمیم آپا چھوٹے چھوٹے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے میں مصروف رہتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہ دونوں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہیں جو ہر حال میں بڑی خوش نظر آتی ہیں۔

چچا کو فکر تھی تو اس بات کی کہ اب لڑکیاں جوان ہو چکی ہیں ان کے ہاتھ پیلے ہونے چاہئیں۔ رشتہ آیا ـــ بات چلی ـــ عورتیں دیکھنے آئیں ـــ مریم جیسی نسیم آپا کو بھلا کون ناپسند کرتا۔

چچا امی کے پاس آئے اور کہنے لگے بھابی لڑکیوں کی ماں نہیں ہے اس کا فرض آپ ادا کریں۔ ذرا نسیم سے اس رشتہ کے لیے اس کی مرضی معلوم کرلیں یہ تو ہمارے مذہب میں بھی جائز ہے، چنانچہ امی نے نسیم آپا سے بات چیت کی تو ایک نیا انکشاف ہوا کہ وہ تو شادی کرنے پر آمادہ ہی نہیں وہ کہتی ہیں ہماری وجہ سے ابا جی نے دوسری شادی نہیں کی تب ہم بھلا انھیں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔ بہت سمجھایا کہ بیٹی باپ آج ہے کل نہیں اللہ انھیں رکھے لیکن ان کے بعد تم اکیلے زندگی کیسے گذاروگی؟ دنیا تمھیں جینے نہ دے گی اور پھر یہ دن تو ہر لڑکی کے لیے آتا ہے وہ عورت اور ماں بن کر فخر محسوس کرتی ہے۔ بہت اونچ نیچ سمجھائی، ہر ممکن کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ کئی رشتے آئے اور واپس چلے گئے۔ اب چچا جان بڑے فکر مند رہنے لگے تھے۔ کئی سال اسی طرح خاموشی سے گذر گئے۔ اب شمیم آپا بھی شادی کے لائق ہو گئی تھیں۔ بڑی بہن کی دیکھا دیکھی انھوں نے بھی وہی ضد ٹھان لی۔ آخر کار ہر ممکن کوششوں کے بعد چچا نے چپ سادھ لی۔ وہ شاید اب اندر ہی اندر اس فکر میں گھلنے لگے تھے کہ ان کے بعد ان دو ضدی لڑکیوں کا کیا ہوگا؟

پھر مجھے وہ صبح بھی یاد آئی ـــ جب چچا اچانک غیر متوقع طور پر بڑے گھبرائے ہوئے آئے تھے۔ کتنے چپکے سے وہ والد کو بلا کر دوباری کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر بڑے رازدارانہ طور پر باتیں کر رہے تھے اس دن نہ وہ اندر آئے نہ بیٹھے نہ ہمیں پیار کیا بلکہ دو تین منٹ کے بعد اسی گھبراہٹ کے ساتھ واپس چلے گئے۔

والد صاحب اندر آئے اور میں دوڑ کر سیدھی دروازے پہ چچا جان دائیں بائیں اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے اور قدم آگے رکھتے جاتے۔ ان کے قدم بھی ڈگمگا رہے تھے منٹ بھر میں ہی وہ گلی کے آخری

موڑ سے اوجھل ہو چکے تھے۔

میں واپس اندر آئی کہ امی سے پوچھوں چچا اندر کیوں نہیں آئے اور اتنی جلدی کیوں چلے گئے اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتی میں نے والد صاحب کو امی سے یہ کہتے سنا کہ شمیم بھاگ گئی۔

کیا ؟؟؟ ــــــ ناشتہ کی ٹرے امی کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور ایک زوردار چھناکے کے ساتھ سب کچھ زمین پر آرہا۔ والد صاحب کپڑے بدل کر یہ جا وہ جا ـــ اور امی تصویر غم بنی گھٹنے پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئیں ـــ اور میں بکھرا ناشتہ اور ٹوٹے برتن سمیٹنے میں لگ گئی۔ دوپہر تک والد آئے تو انھوں نے امی کو بتایا کہ شمیم اس شیر وکباب والے کے ساتھ غائب ہے۔ جو گھر کے سامنے دوکان لگا کر بیٹھتا تھا۔ اس کے بیوی بچے بھی ہیں۔ محمد احمد نے نہ رپورٹ کری اور نہ مجھے کرانے دی۔ وہ کہتے ہیں رپورٹ لکھوا کر کیا کروں جب وہ چلی ہی گئی ہے، وہ میری بیٹی نہیں رہی میری ہوتی تو کلنک لگا کر یوں نہ جاتی۔ گھر پر قبرستان کی سی ویرانی چھا گئی۔

آٹھ دن بعد شمیم آپا جب شیر وکباب والے کے ساتھ اپنے گھر واپس آئیں تو چچا نے انھیں باہر کر کے دروازہ بند کر لیا اور والد صاحب کو بلا بھیجا۔ اس وقت شمیم آپا ایک دلہن کی طرح سجی ہوئی تھیں۔ سونی ہتھیلیوں میں لال لال مہندی، کلائیوں میں سرخ سرخ چوڑیاں، کانوں میں سے جھلمل کرتے بڑے بڑے جھمکے، پتلی سی ناک میں سرخ نگینے کی کیل، پاؤں میں سنہری سینڈل، ملیشیا کے کھردرے کپڑوں کی جگہ اب ریشمی کپڑے سج رہے تھے۔ وہ خود تو ساری بدل ہی گئی تھیں ان کا دل بھی بدل گیا تھا وہ شیر کا سا دل لے کر آئی تھیں۔

والد صاحب پہونچے تو دونوں زینہ کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ شیر وکباب والے نے سچے عاشق کی طرح والد صاحب کے پاؤں پکڑ لئے اور بار بار یہ جملہ دہرایا کہ اگر نکاح نہ کرایا تو وہ اسی زینہ پر زہر کھا کر مر جائے گا۔ والد صاحب کے سمجھانے بجھانے پر چچا راضی ہو گئے اور یوں گھر میں بیٹھا کر دونوں کا نکاح کرا کے رخصت کر دیا۔ جو زیور کپڑا چچا میاں نے رکھ رکھا تھا نسیم آپا سے سب شمیم آپا کو دلوا دیا۔ خود تو نہ چچا پاس آئے اور نہ انھوں نے شمیم آپا کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس دن کے بعد سے چچا باہر نہیں نکلے اور اس صدمہ سے اتنے نڈھال ہوئے کہ مہینہ بیس دن بعد ایک صبح یہ خبر بھی سن لی کہ چچا چل بسے والد صاحب نے آنکھوں کی نمی کو انگلیوں کے پوروؤں سے صاف کرتے ہوئے کہا تھا محمد احمد تو اسی دن

چل بسے تھے جس دن شمیم گھر چھوڑ کر گئی تھی۔

چچا کی وصیت کے مطابق شمیم آپا کو میت میں نہیں بلایا گیا تھا بعد میں خبر پہونچی تو آئیں اور نسیم آپا سے لپٹ کر خوب چیخ چیخ کر روئیں۔ چند ماہ بعد ہی شیرو نے زیور کپڑا چھین کر مار پیٹ کر طلاق دے کر شمیم آپا کو گھر سے نکال دیا اس کے بیوی بچوں نے بھی خوب مارا۔ آخر کار نسیم آپا کے پاس آگئیں۔

دونوں نے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے۔ سر پر کوئی کہنے والا نہ رہا۔ بر قعے بنے، ماحول بدلا، باہر قدم نکلا، آزادی بڑھی، بازار شاپنگ، نمائش میلے۔ پائی پائی جوڑا ستر ہزار روپیہ پھر سے اُڑ گیا۔ پیٹ بھرنا بھی ضروری تھا۔ چچا کے کوئی کاروباری شناسا جو دہلی میں رہتے تھے اور چچا سے آرٹ کا کام کراتے تھے۔ شاید کوئی ایڈیٹر تھے انھیں گروجی گروجی کہتے تھے، نسیم آپا کو اپنے ساتھ دہلی لے آئے۔ شمیم آپا بیچاری کوئی کام نہ جانتی تھیں، اسکول کی پڑھی لکھی ہوئی بھی نہ تھیں۔ ویسے گھر میں ہی چچا نے انھیں اردو اور انگریزی کی تعلیم دی تھی۔ لیکن کچھ کام نہ آیا۔ اکیلے رہنے کی وجہ سے محلہ کے اوباش لڑکے تنگ کرنے لگے۔ گھبرا کر امی کے پاس آئیں کہ کچھ سامان رکھ لیجئے میں دہلی نسیم کے پاس جا رہی ہوں۔ ایک ہی ہفتہ کے بعد واپس پہونچ گئیں اور رو رو کر امی کو بتانے لگیں کہ گروجی اور نسیم آپا کے ناجائز تعلقات ہیں بڑا خراب ماحول ہے لوگ آتے ہیں شراب پیتے ہیں۔ وہ مجھ سے بھی غلط کام کروانا چاہتا تھا انھوں نے مجھے مارا پیٹا بھی میں کسی نہ کسی طرح بڑی مشکل سے نکل کر وہاں سے بھاگی ہوں۔ خوب روئیں پیٹیں۔

امی نے دلاسہ تسلی دی دوسری شادی کی کوشش کی گئی۔ اچھا کھاتا کماتا کوئی لڑکا ملا بات طے ہو گئی۔ کچھ دن بعد میں ایک سنسنی خیز اضافہ ہوا کہ اس لڑکے کا دھندا یہی ہے کہ لاوارث لڑکیوں سے شادی کرتا ہے اور چند دن بعد مول تول کر کے بیچ کر چھٹکارا لیتا ہے اور قیمت وصول کر لیتا ہے۔ وہاں سے جان چھوٹی۔ کچھ دن یوں ہی روکھے پھیکے گذر گئے۔ اس دوران میں شادی ہو کر دہلی آگئی تھی۔۔۔

اور کچھ دن بعد یہ خبر ملی تھی کہ شمیم آپا کی شادی کسی بڑی عمر کے آدمی سے ہو گئی ہے، وہ بھی بیوی بچوں والا ہے اس کی بیوی بیمار رہتی ہے۔ شمیم آپا نے یہ کہکر شادی کے لئے حامی بھر دی کہ کم از کم روٹی کپڑا تو دے گا اور میری حفاظت تو کرے گا۔ پیٹ کی بھوک کے آگے اور کچھ سوچنے کی انسان کو مہلت ہی کہاں ہوتی ہے۔ اللہ کی قدرت کہ دو سال میں شمیم آپا کے دو بچے بھی ہو گئے۔۔۔۔۔۔"

لیکن واہ ری قسمت ان کا شوہر شمیم آپا کو تو کیا پالتا دو بچے بڑھا کر ان کا بوجھ بھی شمیم آپا پر ڈال

کر دنیا سے رخصت ہوگیا اور یوں وہ دو معصوم جانوں کے ساتھ پھر زندگی سے جوجھنے میں لگ گئیں۔
اس دن اچانک میں یوں ہی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہونچ گئی۔ شمیم آپا اپنے دونوں بچوں کو لئے زمین پر پھٹے پرانے کپڑے بچھائے بیٹھی تھیں اور کاغذ کے لفافے بنا رہی تھیں۔ پھول سا چہرہ کمہلا کر نیم کی زرد پتی کی طرح ہو گیا تھا۔ گول گول گالوں میں بڑے چھوٹے گڑھے جنھیں دیکھکر دل چاہتا تھا ان میں شبنمی قطرے بھر دو یا شہد کی بوندیں انڈیل دو پچک کر اندر ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں گھرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے، کالی کالی لمبی ناگن سی چوٹی انھیں بھی ڈس گئی تھی اور خود بھی فنا ہو گئی تھی۔
کپڑوں پر جا بجا پیوند لگے تھے۔
شمیم آپا! یہ کیا حال ہوگیا آپ کا؟؟ ـــــ میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔
کچھ بھی نہیں! اپنے گناہوں کی سزا ہے بی بی ـــــ یہ کہکر انھوں نے ایک طویل سی سانس لی۔
معصوم لاغر اور کمزور سے یتیم بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ میں نے انھیں ایسے ہی پیار کیا جیسے وہ مجھے کیا کرتی تھیں۔ چاروں طرف دیکھا کچھ بھی نہ تھا نہ پلنگ نہ بستر نہ گھر نہ گرہستی۔ وہ مکان جو کسی آرٹسٹ کی قیام گاہ تھا، دیواروں پر قد آدم تصویریں خوبصورت پینٹنگس سجی رہتی تھیں۔ فرش پہ دری اور اس پر گہرے رنگ کا خوبصورت قالین۔ خوبصورت گاؤ تکیے جہاں چچا اپنے آرٹ کا سامان پھیلائے ہمیشہ ہی بیٹھے ہوئے ملتے تھے اور اٹھتے وقت لکڑی کے ایک خانے دار بکس میں سب سامان قرینے سے رکھ دیتے تھے۔ کانس پر کڑھا ہوا کور اس پر رکھا ایک مرادآبادی شمع دان اور روئی کا بنا ایک خوبصورت کتا۔ چھت پر خوبصورت جھنگری۔ چھت کے بیچ میں ایک فانوس۔ جھالر دار لٹکا ہوا پنکھا جسے کوئی نوکر یا بچہ ڈوری کھینچ کر ہلاتا ہی رہتا تھا۔ ـــــ آہ اب وہاں کیا تھا۔؟؟ ـــــ
چھت دھوئیں سے اٹی پڑی تھی۔ جالے دیواروں پر لٹک رہے تھے۔ سڑک پر کھلنے والی وہ کھڑکیاں جن پر خس کی ٹٹی پڑی رہتی تھی، پرانا پھٹا ٹاٹ جس میں میلے کپڑوں کے پیوند لگے ہوئے تھے لٹک رہا تھا تاکہ سڑک کا سامنا نہ ہو۔ فرش کا سیمنٹ جگہ جگہ سے اکھڑ کر گڑھے بنا چکا تھا۔ دیواریں زمین۔ چھت سب سیاہ تھیں وہاں کی ہر چیز مجھے سیاہ لگی۔ میں نے کچھ روپے دونوں بچوں کو دے اور بوجھل دل سے واپس آگئی۔ وقت گذرنے کے ساتھ تمام نقش ذہن سے دھندلے ہو گئے تھے کہ نسیم آپا کو اچانک دیکھ کر ایسا لگا جیسے یہ کل کی ہی بات ہو۔ ان کی جھلک دیکھنے کے بعد سے دل بے چین سا

ہوگیا تھا بہت ضد کرنے پر میرے شوہر ایک دن مجھے ان کے دفتر لے ہی گئے۔ میں پہلی ہی نظر میں انھیں پہچان گئی۔ میز پر جھکی کاغذ اور برش لیے وہ اپنے کام میں غرق تھیں۔ نسیم آپا —— نسیم آپا —— کافی دیر تک بھی جب انھوں نے سر اٹھا کر نہ دیکھا تو میں برداشت نہ کر سکی زور سے آواز دی نسیم آپا —— سر کام سے اٹھایا تو لگا جیسے ایک صدی بیت چکی ہے۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ چہرے پر ایک بے رونقی۔ زمانے کے تھپیڑوں نے ساری معصومیت اور شادابی چھین لی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح انجان نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ فرمائیے کیا بات ہے؟ میں نے سلام کیا۔ کیا مجھے پہچانا نہیں؟ نہیں تو —— آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں؟ کیا کام ہے؟ میرا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ مجھے پہچانیے نسیم آپا میں آپ کے اباجی کے دوست کی لڑکی ہوں۔ میرا بچپن کا نام مینا ہے مینا کچھ یاد آیا —— آپ مجھے کہا کرتی تھیں مینا تمھارا طوطا کہاں ہے؟ میں حکیم صاحب کی لڑکی ہوں —— شادی ہوکر یہاں دلی آئی ہوں یہ کہہ کر میں نے بے چینی سے آنکھوں کے دریچوں میں جھانکا کہ شاید کچھ چمک آئے لیکن وہ چمک بڑی آہستہ آہستہ آئی۔ ہاں ہاں۔ اچھا اچھا اچھا۔ ارے تم مینا ہو۔ بہت بڑی ہوگئی ہو کہو کیسی ہو؟ بیٹھو بیٹھو —— آواز کی لچک اور سریلا پن ایک جھنجھناہٹ میں بدل گیا تھا۔ کہنے لگیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں؟ میں تو کسی سے ملتی ہی نہیں۔ سب کچھ ختم ہوگیا ہے یہ کہتے کہتے وہ سٹ پٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ ان کی یہاں کی کہانی ضرور مختلف ہوگی۔ میں بھی محتاط ہوگئی۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ بچپن کی والدین کی مگر وہ اپنے رشتہ داروں کے ذکر کو نظر انداز کر گئیں اور یہ بات کئی بار دہرائی کہ اب میں کسی سے نہیں ملتی۔ میں نے کہا نسیم آپا میرے گھر چلیے میرے پاس رہیے کچھ آرام ملے گا۔ کہنے لگیں اب کیا رکھا ہے؟ اباجی کے ایک دوست تھے جنھیں وہ مجھے سپرد کر گئے تھے انھوں نے مجھے بہت سہارا دیا ہے میری نوکری لگوائی ہے۔ مجھے بیٹی کی طرح رکھتے ہیں اب جبکہ وہ اندھے ہوگئے ہیں انھیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گی؟؟

اور میں باپ بیٹی بیوی اور رکھیل کا فرق نہ سمجھتے ہوئے اپنی دنیا میں واپس آگئی۔

وہ نیم دیوانی سی تھی۔ بکھرے بے ترتیب بال۔ سَن کی طرح پلیٹی ہوئی بالوں کی لٹیں۔ پھٹے پُرانے تن سے بے نیاز کپڑے۔ آنکھوں میں جمی ہوئی گندگی۔ لیکن اسے شاید ان میں سے کسی بات کا احساس نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی تو اس کا اندھاپن ڈھکے ہوئے تھا۔ اور جب آنکھوں میں اندھیرا ہو تو دل کا اندھیرا تو لازمی ہے۔

وہ ہمیشہ اپنے میلے کچیلے کپڑوں میں دلی گیٹ کے پاس ارون ہاسپٹل کے موڑ پر پیشاب گھر سے تھوڑا ہٹ کر ایک پھٹا سا کپڑا بچھائے فٹ پاتھ پر بیٹھی ہوتی۔ راہ گیر گذرتے تو ضرور کچھ نہ کچھ جیب سے نکال کر اس کی طرف اچھال دیتے۔

میں روزانہ ہی صبح سویرے اس راستہ سے گذرتی تھی۔ دلی گیٹ کے بس اسٹاپ پر بس سے اتر کر مجھے اسکول جانے کے لیے رکشا کرنا پڑتی تھی۔ رکشا سکنڈ بھر میں اس نیم دیوانی کے آگے سے گذر جاتی اور میں چاہتے ہوئے بھی اس کی کوئی مدد نہ کر پاتی۔

کئی مرتبہ مجھے اس بات کا خیال ہوا کہ اسپتال اور قبرستان دونوں جگہیں ایسی ہیں جہاں آکر انسان خدا اور موت دونوں کو یاد کر لیتا ہے اور ایسے میں اگر کوئی نیک کام کرنے کا موقع مل جائے تو وہ چوکتا نہیں۔ اس حساب سے اس بھکارن کے اس جگہ بیٹھنے کا انتخاب بڑی سوجھ بوجھ کی دلیل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے چاروں طرف سِکّے ہی سِکّے بکھرے رہتے تھے۔ جنھیں وہ ٹٹول ٹٹول کر سمیٹتی رہتی تھی۔

میں اسے تقریباً پانچ سال سے دیکھ رہی تھی۔ میں اسے دیکھنے کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ اگر وہ کبھی مجھے فٹ پاتھ پر نظر نہ آتی تو میری نظریں خود بخود اسے چاروں طرف تلاش کرنے لگتیں۔ جاڑے

کا موسم ختم ہوتے ہی وہ اپنی بے ترتیب جوانی کے ساتھ گدڑی سے باہر نکل آتی۔

یکایک ایک دن مجھے احساس ہوا کہ اس کا پیٹ کچھ زیادہ ہی ابھرا ہوا ہے۔ کئی سوال میرے ذہن میں ایک ساتھ پیدا ہوئے۔

"کیا یہ ماں بننے والی ہے"؟ ——————

"کیا یہ شادی شدہ ہے"؟ یا —————؟؟ اور پھر خود ہی میرے دل نے ان مردوں کو بے شمار برا بھلا کہہ ڈالا جو اس طرح کی مجبور عورتوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، ناجائز اولاد پیدا کرتے ہیں لیکن باپ ناجائز بھی بننا گوارا نہیں کرتے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میرے اندر کی عورت نے بغاوت کی کہ اس غلطی کی ذمہ دار عورت بھی ہے صرف مرد ہی نہیں۔ اور پھر دو لفظ میرے ذہن میں ابھرے۔ بھوک ؟؟ غریبی ؟؟ پھر اچانک وہ غائب ہو گئی، کہیں نظر نہ آئی۔ طرح طرح کے وسوسوں نے مجھے گھیر لیا۔ کچھ ہو تو نہیں گیا اسے ؟ بھلا یہاں فٹ پاتھ پر بچہ ؟ کیا ہوا ہوگا ؟ ایک عام سا سوال لڑکا یا لڑکی ؟ شاید اسی اسپتال میں ہو ——————

کچھ دن بعد وہ پھر نظر آئی ایک ننھے منے بچہ کے ساتھ۔ مجھے دیکھ کر اطمینان ہوا۔ کبھی بچہ اس کا دودھ پیتا ہوتا۔ کبھی فرش پر سویا ہوتا۔ کبھی روتا ہوتا اور کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا کہ شاید اس کا بچہ بیمار ہے۔ کچھ دنوں بعد مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت اور دکھ ہوا کہ اس کی گود خالی رہ گئی۔ نہ معلوم اس کے بچہ کو کیا ہوا ہوگا ؟ بچے تو کتنی مشکل سے پلتے ہیں اور اس فٹ پاتھ پر تو دھوپ، گندگی، بارش، گرمی اور شور ——————

ایک سال کے اندر اندر مجھے پھر کچھ ایسے ہی آثار نظر آئے اور وہ درست ثابت ہوئے جب ایک بچہ پھر اس کی گود میں نظر آیا۔ لیکن خدا کو نہ جانے کیا منظور تھا کہ کچھ دنوں بعد اسی طرح وہ بھی غائب ہو گیا۔ پانچ سال میں میں نے چار بچوں کو اسی طرح اس کی کوکھ سے گود میں آتے دیکھا لیکن چاروں ہی اسے اسی طرح اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔

اچانک میرے والد بیمار ہوئے اور انھیں اسی اسپتال میں داخل کرنا پڑا تب میرا آنا جانا وہاں بہت بڑھ گیا کئی کئی مرتبہ اس نیم دیوانی سے میرا سامنا ہوتا۔

ایک رات جب میں وہاں دوبیہ کر واپس آرہی تھی تو مجھے یہ دیکھ کر انتہائی خوشی کا احساس ہوا کہ وہ بمعہ چاروں بچوں کے اسی جگہ موجود تھی۔ اوپر کھمبے سے سرکاری بلب کی روشنی ان پانچوں پر پڑ رہی تھی یقیناً وہ اس کے بچے تھے۔ ایک چار سال ایک تین سال ایک تقریباً دو سال اور ایک گود میں ——— ——— میں نے رک کر ان گندے میلے کچیلے چیتھڑوں میں لپٹے بچوں کو دیکھا اور پوچھا۔

یہ بچے تمہارے ہیں ؟ ؟

دن بھر کہاں رہتے ہیں ؟ ؟

کچھ دیدو نہ مائی ! بھوکے ہیں۔ اس نے میری بات کا جواب دئے بغیر ہاتھ پھیلایا۔

میں نے پرس کھول کر پانچ روپیہ کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا جو اس کے بڑے بچے نے بڑی صفائی سے اچک لیا اور ماں کی مٹھی کھول کر اس کی ہتھیلی میں تھما دیا۔ میں اس کے سارے بچوں کو بڑے تجسس سے دیکھ رہی تھی کہ کون بیٹا ہے کون بیٹی ——— کہ یکایک اس کے سب سے چھوٹے بچے پر میری نگاہیں تھم سی گئیں ——— یقیناً یہ وہی کپڑے تھے۔ یقیناً یہ وہی بچہ تھا۔ لیکن ماں یہ نہیں تھی۔ وہ تو ——— وہ تو کوئی نوجوان عورت تھی۔

میں نے فوراً اس نیم دیوانی کو مخاطب کیا اور پوچھا۔

کیا اپنے بچے کرائے پر چلاتی ہو ؟ ؟

کیوں ؟ ؟ ——— تمہیں کیا ؟ ؟ ——— تم کون ہو ——— ؟ ؟

یہ تو ہمارا دھندہ ہے کرائے پر نہ چلائیں تو بھوک کیسے مٹائیں ——— کوئی باپ تو بیٹھا نہیں ان کا ——— یہ کہہ کر اس نے اندھی آنکھوں سے چاروں بچوں کو اس طرح سمیٹ کر اپنے قریب کر لیا جیسے وہ بہت بڑی پونجی ہوں۔ اس کی بات سُن کر میری طبیعت اتنی بوجھل ہوئی کہ میں اس رات سو نہیں سکی ——— اور رہ رہ کر یہی سوال میرے ذہن کو جھنجوڑتا رہا یہ بھوک کس کی تھی ؟ کون سی تھی ؟

دُوسرا قتل

آج ہمایوں خاں کے گھر دوسرا قتل ہوا تھا۔

پہلا قتل ہمایوں خاں کا ہوا تھا اور اس بے رحمانہ انداز سے ہوا تھا کہ لوگ حیران تھے۔ اول حیرانی تو یہی تھی کہ ہمایوں خاں جیسے دھانسو اور چالاک آدمی کا بھی کوئی قتل کر سکتا تھا۔ اور وہ بھی اس طرح ؟؟؟ بقرا عید کا دن تھا۔ عورتیں اپنے ہاتھوں سے مہندی اتار رہی تھیں۔ کچھ گھروں کی صفائی ستھرائی اور طرح طرح کے کھانے پکانے میں مصروف تھیں، کوئی خود نہا رہا تھا اور کوئی بچوں کو نہلا رہا تھا۔ لوگ عید کی نماز کی تیاری میں مصروف تھے۔ گلیوں میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ ہر کوئی کسی نہ کسی کام سے اِدھر اُدھر بھاگا جا رہا تھا۔ ایسے میں جب یہ خبر سننے کو ملی کہ ہمایوں خاں کا قتل ہو گیا تو کچھ نے تو اسے مذاق سمجھا اور کچھ کو یقین ہی نہیں آیا۔

ہمایوں خاں اپنے محلہ کا بڑا مشہور آدمی تھا۔ ہر ایک سے سلام دعا رکھتا تھا۔ شکل و صورت سے بھی بھولنے کے قابل نہ تھا۔ ناٹا قد، گٹھا ہوا دوہرا جسم، سیاہ رنگت اور سفید گول چمکتی ہوئی آنکھیں اکثر سفید کرتا پاجامہ اور کھادی کی واسکٹ پہنا کرتا۔

پہلے تو کہیں نوکری کرتا تھا لیکن جب سے زمینوں کی دلالی اور خرید و فروخت کا دھندا شروع کیا تھا اس نے نوکری چھوڑ دی تھی۔ جب سے پیسہ اس کے گھر کی باندی بن گیا تھا۔ شراب کی لت بھی پڑی ہوئی تھی۔ سننے ہیں اکثر نشے میں بیوی کو پیٹا کرتا تھا۔

ابھی کچھ ہی روز پہلے کی بات ہے۔ کسی لین دین کے چکر میں تھانے کے داروغہ سے اُلجھ پڑا اور خوب جم کر اس کی پٹائی کر ڈالی۔ اسی داروغہ کو ہمایوں خاں کی بیوی نے اپنا بھائی بنا رکھا تھا۔ ہمایوں خاں کے قتل کے روز بھی اس کی ہمدردیاں اپنی بے عزتی کو بھول کر اپنی بہن کے ساتھ تھیں

دھیرے دھیرے ایک جم غفیر ہمایوں خاں کے گھر کی طرف جمع ہونے لگا۔ جتنے منہ اتنی باتیں کوئی کہتا تھا کئی پارٹیوں کا پیسہ مار لیا تھا اسی کی دشمنی لگتی ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ داروغہ سے لڑائی ہوئی تھی اس کو خوب مارا پیٹا تھا اسی نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔ پولیس والوں سے بھلا کون جیت سکتا ہے کہنے والوں نے بیچاری بیوی تک کو نہ چھوڑا کیونکہ کچھ لوگ ایسا سوچ رہے تھے کہ کہیں بیوی کی وجہ سے تو یہ قتل نہیں ہوا؟؟ غرض کسی کو بھی اس قتل کا راز سمجھ میں نہ آتا تھا، بس جتنے منہ اتنی باتیں۔

سب سے بڑی بے رحمانہ بات تو یہ کہ قتل کے لیے دن بھی بقرعید کا چُنا گیا تھا۔ یا تو اس لیے کہ لوگوں کی توجہ اس طرف کم رہے اور قاتل آسانی سے نکل جائے۔ یا پھر شاید اور کوئی وجہ رہی ہو ــــــ غرض کہ ہمایوں خاں کا قتل اس کے اپنے کمرے میں اپنے ہی بستر پر سوتے میں اسی کی پستول سے کیا گیا تھا۔ ہمایوں خاں پستول ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا اس لیے معاملہ خودکشی کا بھی ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا کسی بات سے دل برداشتہ ہو کر اس نے یہ قدم نشے کی حالت میں اٹھا لیا ہو ــــــ پستول کی گولی کا نشانہ ہمایوں خاں کا سر تھا۔ اس نے شاید اٹھنے کی کوشش کی ہو کہ پھر دوسری گولی کا نشانہ اس کا دل تھا اور وہ خون میں لت پت وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ ہمایوں خاں کی بیوی کے بیان کے مطابق قاتل کون تھا پتہ نہیں۔ وہ تو اپنے تین عدد بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ جب صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو کمرے

میں بند پایا۔ کمرہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے روشن دان سے چلا چلا کر لوگوں کو پکارا تب اس کا کمرہ کھلا۔ تب اسے پتہ چلا کہ دوسرے کمرے میں اس کے شوہر کا قتل ہوا پڑا ہے۔ وہ دہاڑیں مار کر چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ لوگوں کی ہمدردیاں اس جوان بیوہ کے ساتھ تھیں۔ جو روتے روتے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

لوگوں کا کہنا تھا کہ ہیرا پھیری کرنے والے ہمایوں خاں نے پیسہ بٹورنے میں اتنا لالچ دکھایا کہ اس نے کئی اپنے دشمن بنا لئے تھے۔ اس کا ایک سرکل تھا جس میں سب اسی طرح کے بڑے بڑے لوگ شامل تھے جو اسی طرح کا کام کرتے تھے۔ اور مل بانٹ کر اپنا اپنا حصہ لے لیتے تھے۔ اس میں داروغہ تھانیدار اور پولیس والے بھی شامل ہوتے تھے۔ دعوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ پینا پلانا بھی چلتا رہتا تھا۔ ہمایوں خاں کو اس سے یہ فائدہ تھا کہ اچھے بُرے وقت میں وہ سب اس کا ساتھ دیتے تھے۔

قتل کی رات کو چوپال پر آٹھ دس لوگوں کے ساتھ مل کر اس نے شراب نوشی کی تھی اور رات گئے تک گھر لوٹا تھا۔ پڑ کر سویا تو سوتا ہی رہ گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یا تو قاتل نے جان بوجھ کر شراب پلائی یا پھر قاتل اس انتظار میں تھا کہ کس دن ہمایوں خاں شراب کے نشے میں ہو تاکہ اس کا کام آسان ہو سکے اور اسے زیادہ جدوجہد نہ کرنا پڑے۔ چاہے وہ دن بقرعید کا ہی کیوں نہ ہو۔

ہمایوں خاں اپنی بیوی کو بہت چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ خود خوبصورت نہ تھا۔ اور اس کی بیوی حد درجہ خوبصورت اور سانولا حسن لئے ہوئے تھی۔ وہ ہر طرح کا عیش و آرام اپنی بیوی اور بچوں کے لئے مہیا کرنا چاہتا تھا اور اس میں وہ یہ بھی بھول جاتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی عالیشان کوٹھی تیار ہو گئی تھی۔ دنیا بھر کے عیش اس نے اپنے گھر میں مہیا کر لئے تھے۔ کار دروازے پر کھڑی رہتی تھی بچے اچھے اسکولوں میں جانے لگے تھے۔ بیوی ہر وقت بنی سنوری رہتی تھی۔ مختلف جگہوں پر اس کی زمین اور فارم خریدے ہوئے پڑے تھے۔ سب کے لئے سب کچھ کرنے کے بعد وہ خود اس دنیا سے چلا گیا تھا۔

تین بکرے ہمایوں خاں کے آنگن میں بندھے تھے جن کی قربانی کرنے سے پہلے وہ خود قربان ہو چکا تھا۔

لوگ آتے اور چھٹ جاتے۔ پولیس آئی، کاغذی کارروائی ہوئی، لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجی گئی۔ آخری رسوم کے بعد پولیس ہمایوں خاں کی بیوی نسیم بیگم کو لے گئی۔ اصل دکھ اور تعجب تو اس وقت ہوا جب ہمایوں خاں کے بچوں کو پڑھانے والے ماسٹر صاحب جن کی عمر ابھی صرف بیس سال تھی اور وہ خود بی کام کے طالب علم تھے۔ نام احسان تھا اور پڑوس میں ہی رہتے تھے، کو بھی پولیس گرفتار کر کے لے گئی۔ بے چارہ اچھے گھرانے کا بہت شریف لڑکا تھا۔ محلہ میں کبھی اس کی نظریں اونچی ہی نہ اٹھی تھیں۔ باپ کا کپڑے کا اچھا کاروبار تھا۔ بے چارے گھر والوں کو کچھ سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اچانک کیا آفت آگئی جس میں ان کا بیٹا بھی گرفتار ہو گیا۔ ساری عزت خاک میں مل گئی۔ کیا احسان کا صرف اتنا قصور تھا کہ وہ ہمایوں خاں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے جاتا تھا ؟؟؟

اس واقعہ کو تین سال گذر گئے۔ بہت سی کہانیاں گھڑی گئیں۔ اور سنی گئیں۔ حقیقت کیا تھی خدا بہتر جانے۔ بس اتنا معلوم تھا کہ نہ نسیم بیگم کی ضمانت ہوئی تھی نہ احسان کی ــــ کیوں ــــ یہ بھی نہیں معلوم ــــــــ لوگ کہتے تھے کہ اس قتل کے پیچھے کوئی لمبی سازش ہے۔ ہمایوں خاں کو قتل کر دیا۔ بیوی کو جیل بھیج دیا۔ کیس بنانے کے لئے بے چارے احسان کو پھانس دیا۔ اب ساری دولت پر دوسرے عیش کریں گے۔

نسیم بیگم کے خاندان میں سنا تھا کوئی ہے ہی نہیں پھر کون خبر گیری کرے ــ ــ ــ ــ جیٹھ اور دیوروں کو کیا پڑی ہے جو بھاوج کو چھڑائیں اور خود اپنے ہاتھ کٹوائیں۔ البتہ احسان کے ماں باپ اور بہن بھائی اس کے لئے تڑپ تڑپ کر روتے تھے۔ باپ اور بھائیوں نے ہزاروں روپیہ پھونک ڈالا تھا لیکن کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔

یکایک حالات بدلے۔ اور نسیم بیگم اور احسان دونوں ہی چھوٹ کر آگئے۔ اب سرکاری داؤ پیچ تو معلوم نہیں، پتہ نہیں کیا ہوا۔ کیس ختم ہوا کہ نہیں۔ سنتے ہیں سرکاری گواہ بننے سے جان چھوٹ گئی۔

نسیم بیگم نے آکر اپنے بچے اور اپنا گھر سنبھال لیا۔ سارے جیٹھ جٹھانی اور دیوروں کو انھوں نے آہستہ آہستہ راستہ نپوا دیا۔ جتنے حالات خراب ہوئے تھے اس سے زیادہ سدھرنے لگے۔

ایک کالا بادل موت کا سایہ بن کر ان کے اوپر منڈلا رہا تھا سو چھٹ گیا۔ وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ اجلی اجلی نکھری نکھری نظر آنے لگیں۔ وہی بناؤ سنگھار، وہی نئی طرز کے کپڑے، وہی تیکھے انداز ـــــ کچھ دنوں تو لوگوں کو بہت کھٹکا لیکن پھر دیکھتے دیکھتے عادی ہو گئے ـــــ اور بھول گئے۔

اب حیرانی اس بات پر تھی کہ اب دوسرا قتل ہمایوں خاں کے گھر میں کس کا ہو گیا؟ ـــــ اسی محلہ میں رہنے والے ایک خوبصورت نوجوان صادق کا ـــــــــــــــــــــــ

احسان تو اپنے باپ کے کاروبار کے سلسلہ میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ قاتل نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ پولیس ابھی تک کسی کو گرفتار نہیں کر سکی تھی۔

بہت بعد میں احسان کے ایک بہت قریبی دوست سے معلوم ہوا کہ جیل سے واپسی پر نسیم بیگم نے احسان کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ـــــ انھوں نے احسان پر کوئی گھاس نہیں ڈالی۔ احسان سے یہ برداشت نہ ہوا۔ جس کی خاطر اس کی تمام عمر خراب ہوئی تھی، اب وہ کسی اور سے ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ سنا ہے ایک دن قبل احسان نسیم بیگم کے منہ پر تھوک کر آیا تھا۔

کسک

ایک پوز کھنچوا سکتا ہوں؟"

ضرور — آیئے — اندر تشریف لایئے۔

شیشہ ہوگا؟ — اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

جی ہاں! اندر تشریف لے جایئے۔ تیار ہو جائیں تو کہہ دیجئے گا" — پہلی ہی نظر میں مجھے محسوس ہوا تھا کہ یہ شخص کسی فلمی ہیرو سے کتنی مناسبت رکھتا ہے۔ بالکل ڈپلی کیٹ —

یس میڈم" — چند منٹ بعد اندر سے آواز آئی —

پردہ ہٹا کر میں اندر چلی گئی — کیمرہ درست کیا — وہ ابھی تک شیشے میں اپنے بال سنوار رہا تھا —

معاف کیجئے گا — یہ آپ کا شیشہ — ذرا — ایک فٹ اور اونچا ہونا چاہیئے تھا۔ مجھے کافی جھکنا پڑ رہا ہے۔

میں نے دیکھا واقعی اسے اپنے گھٹنے موڑنے پڑ رہے ہیں۔ اس کا قد بہت اونچا تھا۔ میں نے اسٹول اس کی طرف بڑھا دیا۔ اسٹول پر بیٹھ کر بڑے آرام سے وہ اپنے بال درست کرنے لگا تیار ہو کر وہ فوٹو کے لیے بیٹھ گیا اور میں اس کا چہرہ فوکس میں کرنے لگی۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

ذرا سائیڈ پوز لیجئے گا — میرا چہرہ کھٹا و یسے ہی ذرا" — اور پھر وہ خود ہی مسکرانے لگا مختلف اسٹائل میں اس نے ایک پوز کی جگہ کئی پوز کھنچوائے۔ بڑا شوقین معلوم ہوتا تھا۔

میرا نام سکندر ہے — مجھے بل کہتے ہیں۔ میرے فادر کا چشموں کا بہت بڑا کاروبار ہے ..." پوز کھنچواتے وقت اس نے خود ہی بتایا۔

کیا آپ اپنا نام نہیں بتائیں گی؟

"جی ..... اس کی ضرورت نہیں"

میڈم ـــ ضرورت تو مجھے فوٹو کی بھی نہیں ـــ میں تو صرف ـــــ میں تو صرف آپ کو دیکھ کر ـــــ خیر چھوڑئیے۔"

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ـــــ اس کی آنکھوں سے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی رسید کاٹ کر اُسے ٹالنے کی کوشش کی۔ اس کے اس انداز کو دیکھ کر میں نے ایڈوانس بھی چھوڑ دیا۔

کیا آپ مجھ سے دوستی کر سکیں گی؟۔۔۔ اس نے دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

اے مسٹر! ذرا ہوش میں آیئے۔"

کیا میں آپ کو بے ہوش لگ رہا ہوں؟ اس کا ہاتھ ابھی تک بڑھا ہوا تھا۔

یہ فوٹوگرافر کی دوکان ہے کوئی دوستی کا اڈہ نہیں، غصہ سے میری آواز کانپ رہی تھی۔

تو پھر دوستی کے اڈہ پر کب ملاقات ہو گی؟

آپ بہت ڈھیٹ ہیں۔

شکریہ، اس القاب کے لئے۔

آپ جاتے ہیں کہ نہیں ـــ شرم نہیں آتی آپ کو ایسی باتیں کرتے ـــ "

شاید میں نے کوئی بات بھی ایسی نہیں کی۔

دیکھئے آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ایک شریف لڑکی ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ آپ چپ چاپ یہاں سے چلے جائیں تو بہتر ہے۔"

"ارے تو پھر اتنے غصے کی کیا بات ہے!"

شادی شدہ ہیں تو کیا ہوا؟؟ دوستی صرف دوستی۔ اس نے پھر ہاتھ بڑھایا۔

"میں آخری بار کہتی ہوں آپ دوکان سے باہر ہو جائیں ورنہ مجھے کوئی اور انتظام کرنا پڑیگا۔"

"آپ تو ایسے چلا رہی ہیں کہ جیسے میں ـــــ اچھا ناراض نہ ہوئیے۔ میں چلتا ہوں۔ گڈ بائی! ـــــ اور اس نے ایک ہی جھٹکے سے میرا ہاتھ کھینچا اپنے ہونٹوں سے لگایا اور پل بھر میں یہ جا وہ جا ـــــ مارے غصے کے میں اندر سے کسی بھٹی کی طرح دہکنے لگی۔

کمبخت اب کی بار آجائے تو جوتوں سے خبر لوں گی۔ یہ مجال ـــــ؟ یہ ہمت ہوئی کیسے؟

سمجھا کیا ہے خود کو ـــــ؟ ہو گا کچھ اپنے لئے۔ کتنے پھرتے ہیں ایسے نہ جانے ـــــ میں غصہ میں
نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہی۔ گھنٹوں تک میری رگوں کا خون کھولتا رہا۔

فوٹو گرافی کی دوکان کھولے مجھے تقریباً چار سال گذر چکے تھے۔ لیکن ایسے سر پھرے سے
پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ کئی دن بعد وہ پھر اسی طرح موجود تھا۔ نشے سے آنکھیں سرخ تھیں۔ ایک
مرتبہ پھر مجھے خوف کا احساس ہوا لیکن تمام تر قوت جمع کی۔ اس کی طرف نہایت غصیلی نظروں
سے دیکھا۔

"میرے فوٹو تیار ہیں؟" اس نے ڈھٹائی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

جی ہاں! یہ لیجئے اور یہ لیجئے بل۔ پیسے دیجئے اور برائے مہربانی اسٹوڈیو سے باہر ہو جائیے۔

کیا ہوا؟؟؟ اس نے اپنے فوٹو دیکھتے ہوئے انجان بن کر ایسے پوچھا جیسے اس کو پتہ ہی نہیں
کردہ کرکے کیا گیا تھا۔ واہ مان گئے استاد ـــــ کیا پوز کھینچے ہیں۔ ـ ـ ـ ـ ـ اس نے اپنے
ایک ایک پوز کو کبھی دور کبھی پاس آڑا ترچھا کر کے دیکھا۔

چند پوز اور کھینچیں گی۔؟؟"

جی نہیں۔ میں نے غصہ سے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔ ـ ـ اسٹوڈیو سے باہر ہو جائیے۔

پلیز! صرف چند پوز۔ ـ ـ ـ ـ"

کہہ دیا نا۔ نہیں۔ ـ ـ چلے آتے ہیں۔ جانے کیسے کیسے شرابی۔

جی کیا کہا۔ ـ ـ ـ ـ ـ"

یہی کہ میں آپ کے فوٹو نہیں کھینچوں گی۔ آپ جا سکتے ہیں۔ تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔
ـ ـ ـ ـ نکالئے کیسے نکالتی ہیں۔ ـ ـ ـ ـ اور وہ بڑے آرام سے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ میں
چرس بھرنے لگا۔

کمال ہے ـــــ اس نے اپنے دونوں کندھے اچکائے۔ ارے آپ کیسی دوکاندار ہیں ـــــ
کیا خاک بزنس کریں گی۔ ـ ـ ـ ـ کسٹمر سے اس طرح پیش آتی ہیں۔ ـ ـ ـ ـ کون آسکے گا
آپ کے یہاں۔ ؟؟

نہ آئیں ـــــ میں کوئی بھوکی نہیں مر رہی ہوں ـــــ شوق میں کام کرتی ہوں۔ ـ ـ

۔۔۔ مجھے آپ جیسے کسٹمرس بالکل نہیں چاہئیں۔۔۔۔"

ارے آپ اتنا ڈرتی کیوں ہیں؟ ـــــــــ میں کوئی حرکت کروں تو سڑک پر کھڑا کرکے جوتے لگوا سکتی ہیں۔ جو چاہیں کرا سکتی ہیں ـــ اس پیدا کرنے والے کی قسم میرا یقین تو کیجئے۔

اس کی اس قسم میں نہ جانے کیا اثر تھا ـــ میرا دل نرم پڑنے لگا ـــــــــ

اب تو فوٹو کھینچ دیجئے"ـــ اس نے مسکراتے ہوئے کہا

چپ رہو۔ مسکرانے کی ضرورت نہیں۔

اوہ ـــ اس پر بھی پابندی ہے ـــ سوری ـــ ویری سوری ـــــ

اس نے اپنے سات پوز کھنچوائے ـــ سگریٹ پھونکتے ـــ مرغولے اڑاتے ـ چشمہ لگاتے فلموں کا انداز بنا کر ـ اسمگلر بن کر ـ بیچ بیچ میں وہ مجھے ڈائریکشن دیتا جاتا: "دیکھئے آپ کے کیمرے کا کمال جب ہے جب میں بالکل اسمگلر لگوں۔ یہ بریف کیس بالکل اسی سائیڈ میں میری آنکھیں وحشت زدہ ـ اور قدم ـ بالکل اسی طرح ـــ باقی آپ خود ہی دیکھ لیجئے ـــ یہ کہہ کر وہ ہر اسٹائل سمجھا کر خود ہی مسکرا پڑتا۔ کسی پوز میں قمیض اتار کر کندھے پر ڈال لیتا، کسی میں کالا رومال پٹی بنا کر سر پر باندھ لیتا، کسی میں گلے میں بہت ساری مالائیں پہن لیتا، کسی میں گلے میں موٹا سا دھاگا پہن لیتا۔ پوز بناتا اور پوچھتا "یہ کیسا رہے گا"؟

سفید چادر کندھوں پر اوڑھتا۔ بہت ساری مالائیں گلے میں پہنتا اور ہاتھوں کی کلائیوں میں لٹکا کھلے سینے اور کھلے بازوؤں سے دونوں بازو آسمان کی طرف پھیلاتا اور پوچھتا "کیسا رہے گا؟"

بہت عمدہ ـ بس ذرا گردن بھی تھوڑی سی اوپر ہی رکھیں اور ایسا تاثر دیں کہ خدا سے مخاطب ہیں"

گڈ گڈ ـــ یس ـــ ریڈی ـــ تھینک یو ـــــ"

اس طرح وہ جب بھی آتا میرے کئی گھنٹے برباد کر جاتا۔ لیکن ایک اچھا ماڈل ہاتھ آجانے سے میرے آرٹ کو کچھ تسکین ضرور محسوس ہوتی ورنہ تو پاسپورٹ سائز کھینچتے کھینچتے اپنے کام سے مجھے بوریت ہونے لگی تھی۔

اور پھر ایک دن ۔۔۔ دیکھئے اب تو میں آپ کو بالکل پریشان نہیں کرتا ـــ میں نے آپکی

بات مان لی ـــــــ لیکن آپ نے میرا دل توڑا ہے۔

میری دوستی قبول نہیں کی ـــــــ"

پھر وہی بیہودہ باتیں ـــــ تم آخر سمجھتے کیوں نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم آخر چاہتے کیا ہو؟

پیار ـــ صرف پیار ـــ محبت ـ جس پر فرشتے بھی سجدے کرتے آئے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ میرے لئے کیا ہیں ؟؟ میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں ـــــــ

بکواس بند کرو ـــــ میں تمہارے تھپڑ رسید کر دوں گی۔ سمجھے ـــ میں بچی نہیں ـــ جو تمہارے جھانسوں میں آجاؤں گی ـــــــ"

کیا کہا ـــ جھانسہ ـــــــ ؟؟

میڈم برداشت کی کوئی حد ہوتی ہے ـــــ کیا آپ خود کو بہت خوبصورت سمجھتی ہیں۔؟ کیا آپ دوسروں کے جذبات کو صرف ایک ہی نظریہ سے تولتی ہیں۔ کیا کیا ہے میں نے آپ کے ساتھ ـ ؟ یہی کہ صرف محبت اور دوستی کے چند لمحے مانگے تھے۔ یہ بھی آپ ہیں جو میں نے اتنی باتیں برداشت کر لیں۔ مجھے پتہ ہے سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں ـــ آپ سوچتی ہیں میں شراب پیتا ہوں۔ نہیں ! میں نے کبھی نہیں پی ـــــ میں اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔"

اوہ ـــ اسی لیے بگڑ گئے ہو ـــ میں نے طنزیہ کہا ـــ

نہیں ـــ میں صرف خود کو بھولنا چاہتا ہوں۔

ہر نشہ کرنے والا یہی کہتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔

میڈم آپ کو میری بات سننا پڑے گی۔

میں نے بھی ایک لڑکی کو چاہا تھا۔ پروین ـــــ ہاں اس کا نام پروین تھا ـــ لیکن وہ بھی اپنی نہ ہو سکی۔ آپ سوچتی ہیں میں آپ سے ایسا ویسا چاہتا ہوں ـــ توبہ توبہ ـــ لیکن اس میں بھی آپ کا قصور نہیں۔ ہر خوبصورت لڑکی ایسا ہی سوچ لیتی ہے۔ آپ بھی بس اتنا ہی سوچ سکیں ـــــ میں تو کچھ اور ہی سوچ کر یہاں آیا تھا۔ میں نے آپ سے ـــــ آپ سے ـــــــ آپ کو دیکھ کر لگا تھا جیسے کا سہارا مل جائے گا۔

یہ دیکھئے ـــــــ یہ فوٹو دیکھ رہی ہیں آپ ـــــ اس نے اپنی پاکٹ پرس سے ایک

چھوٹی سی تصویر نکالی ۔"یہ مجھے بچپن میں ہی چھوڑ کر چلی گئیں ـــــ دیکھا آپ نے ۔ ؟ ! حیرانی سے میری آنکھیں پھیلنے لگیں ـــــ وہ بالکل میری ہی ہم شکل تھی ـــ اگر میں اپنے بالوں کے بیچ بالکل سیدھی مانگ نکال لوں تو کوئی فرق نہ رہے گا۔"دیکھ لیا ؟" اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا ـــ یہ میری ماں تھی ۔ یہ سب کچھ میں آپ کو مرعوب کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ دل کے کسی کونے میں ایک کسک سی موجود تھی شاید وہ نکل جائے ـــــ اسی جذبہ کے تحت میں نے آپ کا ہاتھ چومنے کی جسارت کی تھی ۔ میں جا رہا ہوں ـــــــ کبھی نہیں آؤں گا ـــــ" میں نے لمحہ بھر سوچا ـــــ مجھے محسوس ہوا وہ مجھ سے بہت بلند ہے ـــــ اپنے قد سے بھی کہیں اونچا ـــــ سکندر سکندر ـــــ سنو ـــــ سنو تو ـــــ سکندر سنو ـــــ وہ مڑتے مڑتے رکا ـــــ جب اولاد جوان ہو جاتی ہے تو دوست بن جاتی ہے ـــــ ہاتھ بڑھاؤ مجھے تمھاری دوستی قبول ہے ـــــ

محافظ

جیسے ہی ذرینہ اسٹیشن پر اتری اسے احساس ہوا ماحول بدلا بدلا سا ہے آگے بڑھی تو معلوم ہوا شہر میں کرفیو نافذ ہو چکا ہے۔ اسے فوراً ملکہ کی بات یاد آئی جس نے ہوسٹل ہی میں اس سے کہا تھا "ذرینہ اس بار گھر مت جا، حالات خراب ہیں۔" "تو میرے ساتھ لکھنؤ چل میرے یہاں عید منانا۔" اور اس نے بے پروائی سے کہا تھا "نہیں بھئی ہم سب بہن بھائی عید ہمیشہ اپنے گھر مناتے ہیں، مجھے وہاں کوئی خطرہ نہیں سب اپنے ہی ہیں۔"

ذرینہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ بھاری بوٹوں والے دو محافظوں نے اسے ریلیف کیمپ میں رات گذارنے کا مشورہ دیا اور کرفیو کھلنے پر اسے باحفاظت اس کے گھر پہونچانے کا وعدہ کیا۔

دوسرے دن ان دو محافظوں نے اسے گھر تو ضرور پہونچا دیا لیکن ریلیف کیمپ میں وہ اس کی عزت کی حفاظت نہ کر سکے کیونکہ محافظ تو وہ خود ہی تھے۔